ترقی پسند شاعر، انقلابی رہنما

مخدوم محی الدین

حیات اور ادبی خدمات

شفقت رضوی

ایوان اردو - تیموریہ - نارتھ ناظم آباد کراچی

کتاب : مخدوم محی الدین - حیات اور ادبی خدمات

مصنف : پروفیسر شفقت رضوی

تاریخ اشاعت : اگست ۱۹۹۴ء

تعداد اشاعت : ۵۰۰

قیمت : ۸۰ روپیہ (مجلد)

: ۷۵ روپیہ (غیر مجلد)

پریس : پرنٹنگ محل، ناظم آباد، کراچی

ناشر : ایوان اردو بلاک بی - تیموریہ - نارتھ ناظم آباد کراچی

فہرست مضامین

پہلی بات

وہ لوگ جنہوں نے نصف صدی قبل کی دنیا دیکھی ہے دورِ حاضر میں انسان کے تنزل پر حیران بھی ہیں اور اشک فشاں بھی! آج نہ شخصی اوصاف و کردار میں بلندی نظر آتی ہے، نہ اجتماعی شعور کی بیداری کے نتیجے میں ایثار و قربانی، محبت و اخوت کی داستانیں رقم ہوتی ہیں۔ لوگوں میں نہ تو اپنی زیست گزارنے کا سلیقہ ہے اور نہ دوسروں کی زندگی سنوارنے کا جذبہ! فکری قوتیں مفلوج ہو چکی ہیں، صالح جذبات دم توڑ چکے ہیں۔ ایسے میں کبھی روشنی کی ہلکی سی کرن بھی جاگتی ہے تو تاریکی آشنا اسے پہچان نہیں پاتے۔

تاریخ میں بہت پیچھے کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ موجودہ صدی کے ربع اول میں کردار اور گفتار کے اتنے غازی پیدا ہوئے کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ وہ برسہا برس معاشرتی، سیاسی اور تمدنی زندگی پر چھائے رہے۔ تاریخ ساز بزرگوں کا ذکر نہیں، ان کے علاوہ بھی قابل تقلید لوگوں کی کمی نہ تھی۔ ان کی زندگیاں، ان کے اعمال، ان کے کردار اور اوصاف اور ان کی محبتیں آنکھوں کو روشنی عطا کرتی تھیں، دلوں کو گرماتی تھیں، راہ حق پر چلاتی تھیں۔ انسانی اقدار کی بلندی ان کے دم سے تھی۔ آج کی بھٹکتی روحوں کے سامنے ان کے احوال، آثار اور افکار بار بار لائے جائیں تو شاید ان کی بے راہ روی ختم ہو اور بامقصد زندگی گزارنے کا حوصلہ ملے۔ ان کے اذکار میں قصیدہ خوانی نہ ہو، جذبہ حقائق کے انکشاف کا ہو تو شاید دلوں پر اثر کر جائے۔

مخدوم صاحب ترقی پسند شاعر تھے۔ انقلابی رہنما تھے، خوش مزاج انسان تھے، مخلص اور محبت کرنے والے شخص تھے۔ ان کے کارناموں کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں، ان کی شاعری کو بھلا دیا جائے تب بھی وہ بڑے آدمی اور اچھے آدمی نظر آئیں گے۔ آدمی کی بڑائی یہ نہیں کہ وہ اپنی دولت سے دوسروں کی نگاہ کو خیرہ کرے، بڑائی یہ نہیں کہ اپنے طاقت سے کمزوروں کو زیر کرے، بڑائی اس میں ہوتی ہے کہ اپنے

عمل سے دلوں پر حکومت کرے۔ ان معنوں میں مخدوم صاحب کی بڑائی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مخدوم صاحب سے میرے بہت سے ظاہری اور باطنی رشتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور انہوں نے میری زندگی اور کردار کو سنوارنے میں غیر محسوس طریقے سے رہنمائی کی ہے۔ کبھی اختلاف رائے ہوا ہے۔ کبھی اپنے عمل سے شرم ساری بھی ہوئی ہے۔ ہر حال میں ان کے چہرہ پر دلنواز مسکراہٹ ہی دیکھی۔ عرصہ سے دل میں خلش تھی کہ جن ہستیوں کو رہنما قوت بنا کر جہاد زندگی میں معرکے سر کئے ہیں ان کی عظمتوں کے چند نقوش دوسروں تک پہنچاؤں۔ مولانا حسرت موہانی کے بارے میں چند کتابیں اور بے شمار مضامین اسی اعتراف کے شاہد ہیں۔ مخدوم صاحب کا میں مقروض تھا۔ اس کتاب کو اس تمنائے ناتمام کا ایک ریزہ سمجھتے ہوئے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

کتاب میں میں نے اپنی ذات کے حوالے سے کوئی بات نہیں لکھی ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا کیونکہ اس طرز میں ممدوح پر "میں" غالب رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسروں کے حوالہ سے وہی لکھا ہے جو میرے دل میں ہے۔

حالات انتہائی ناساز گار ہیں۔ شغل علم و ادب کا شمار کار بیکاراں میں ہونے لگا ہے۔ لیکن کوئی طاقت ہے کوئی جذبہ ہے جس نے مجھے یہ کتاب ترتیب دینے پر مجبور کیا۔ یہ کوئی تحقیقی کارنامہ نہیں ہے۔ صرف مخدوم صاحب کا ہمہ جہتی تعارف ہے۔ اختصار کے ساتھ لیکن جامع! یہ بنیاد ہے جس پر کوئی اعلیٰ پایہ کا محقق اہم مقالہ یا تصنیف تیار کر سکتا ہے۔ اسے نشان راہ گردانئے جو کسی کو منزل تک پہنچائے۔ مخدوم صاحب پر ایم۔اے کے لئے ایک مقالہ اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے دو مقالے بھارت میں لکھے گئے ہیں۔ ایک ایسے شخص کے بارے میں جو .P.R کے گر سے ناواقف ہو اور پیار کے سہارے زندگی گزار گیا ہو۔ اتنا کام بھی بہت ہے۔ انہیں پڑھ کر پیاس بجھی نہیں بھڑکی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہاں پاکستان میں

"کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق"

شفقت رضوی

اگست ۱۹۹۴ء

بی/۵۵، حق باہو پلازہ
گلشن اقبال، بلاک ۱۳ سی
کراچی ۷۵۳۰۰

پہلا باب

کائنات سال و سن

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزار بھی ہے
سازو آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی آب حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

نام ابو سعید محمد مخدوم محی الدین حذری۔ کئی پشت قبل ان کے بزرگ مولوی رشید الدین اور سید جعفر علی ترک وطن کر کے شمالی ہند سے دکن آئے تھے اور ضلع میدک کے قصبہ منمول میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے پر دادا مخدوم الدین تھے۔ وہ قاری اور اچھے پیراک تھے۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ فطرت تخلص کرتے تھے۔ دادا محمد احسن الدین، نانا سید جعفر علی تھے۔ گویا ان کے نانا سید، نانی پٹھان اور ددھیال شیخوں کی تھی۔ والد غوث محی الدین تحصیل کے دفتر میں صیغہ دار کلرک تھے یہ گھرانہ مذہب پرستوں اور خطاطوں کا تھا۔

تاریخ پیدائش: مخدوم کے سال پیدائش میں اختلاف ہے۔ انھوں نے نریش کمار شاد کو جو انٹرویو دیا تھا اس میں سال پیدائش ۱۹۱۰ء بتلایا تھا یہی سال ان کے تعلیمی ریکارڈ میں درج ہے۔ داؤد اشرف نے اپنے ایم۔ اے کے مقالے میں ان کی والدہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جس رجسٹر میں افراد خاندان کی پیدائش کی تاریخیں درج ہیں، اس میں مخدوم کی تاریخ پیدائش ۴ فروری ۱۹۰۸ تحریر ہے۔ رسالہ صبا حیدر آباد دکن کے مخدوم نمبر میں لکھا گیا ہے کہ ''ان کی والدہ کا کہنا ہے کہ جب موسیٰ ندی میں طغیانی (ستمبر ۱۹۰۸) آئی تھی اس وقت مخدوم کی عمر آٹھ ماہ تھی'' ۔(ص ۲۵)۔ والدہ کے دونوں بیانوں میں مطابقت ہے، اس لئے صحیح تاریخ ۴ فروری ۱۹۰۸ء (م یکم محرم الحرام ۱۳۲۶ھ) ہی قرار پاتی ہے۔

بچپن : مخدوم ضلع میدک کے گاؤں اندول میں پیدا ہوئے۔ چار سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد والدہ نے دوسری شادی کرلی اور شہر حیدرآباد منتقل ہوگئیں۔ طویل عرصے تک مخدوم اپنی والدہ کے بارے میں لاعلم رہے۔ حیدرآباد میں مستقل قیام کے بعد انھیں علم ہوا تو والدہ کو اپنے گھر لے گئے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

بچپن میں والدین کی سرپرستی سے محروم ہو جانے کے باوجود ان پر منفی نفسیاتی اثرات نہیں پڑے۔ ان کے چچا بشیرالدین نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس قدر شفقت و محبت سے پیش آئے کہ انھیں والدین کی یاد نہیں آئی۔ بشیرالدین نہایت ملنسار، نیک دل اور کنبہ پرور تھے۔ وہ بھی تحصیل میں صیغہ دار تھے۔ بعد میں ترقی کرکے تحصیل دار ہو گئے تھے۔ ان کا گھرانہ مذہبی تھا۔ ہر فرد شعائر اسلامی کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ مخدوم کی تعلیم کا آغاز بھی ناظرہ قرآن شریف سے ہوا۔ اس کی تعلیم ان کے دادا نے دی تھی۔ گھر کے مذہبی میلان کے حوالے سے مخدوم نے کہا :

> "میں نے مولسری کے بیجوں پر ختم خواجگان، مولود شریف پڑھنے سے لے کر مسجد کی جاروب کشی کی اور اذان تک دی۔ مسجد میں نمازیوں کے لئے کنویں سے پانی نکالتا۔ ہر جمعہ کو سر منڈواتا، سخت گرم پانی سے نہاتا اور روزانہ کے معمول میں فرض و سنت اور نوافل کے علاوہ اشراق اور چاشت کی نمازیں پڑھتا۔"

(امیر عارفی کو دیا گیا انٹرویو مطبوعہ رسالہ "صبا" مخدوم نمبر ۱۹۶۵ء : صفحہ ۲۸۴)

قوم پرستانہ جذبے کی بیداری : بشیرالدین مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ قوم پرست بھی تھے، انھیں سیاست سے خاص دلچسپی تھی۔ گھر میں وہ گاندھی، مولانا محمد علی اور بی اماں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ گھر میں چرخہ بھی چلتا تھا۔ وہ خود بھی کھادی پہنا کرتے اور گھر کے چھوٹے بڑوں کو بھی پہناتے تھے۔ تحریک خلافت کے وقت مخدوم کی عمر ۱۱، ۱۲ سال تھی۔ چچا اس تحریک کے زبردست حامی تھے۔ وہ گھر والوں کو تحریک کی باتیں بتلایا کرتے تھے۔ اس لئے مخدوم کے ننھے دماغ میں انگریزوں کے خلاف نفرت

جاگزیں ہوگئی۔ وطن سے محبت کا ایسا تاثر ملا جو کبھی ختم نہ ہوا۔ چچا کی زبانی انھوں نے انقلاب روس (اکتوبر ۱۹۱۷ء) کا حال سنا تھا۔ اس بارے میں انھوں نے بتلایا ہے کہ :

"میں نے سب سے پہلے روس اور لینن کا نام اپنے چچا کی زبان ہی سنا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ چچا نے ایک رات دستر خوان پر سب عورتوں، بچوں کو بالشویک انقلاب کی خبر سنائی۔ وہ خوشی اور جوش کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ روس میں بالشویکوں نے بادشاہ کا تختہ الٹ دیا ہے، مساوات آگئی ہے۔ اب کوئی امیر اور غریب نہیں، سب برابر ہوگئے ہیں اور سب ایک دسترخوان پر مل کر کھاتے ہیں۔ اس وقت میرے ننھے دماغ میں انقلاب کی ماہیت تو کچھ سمجھ میں آئی نہیں مگر ذہن میں اس خیال کی عجیب و غریب تصویر تھی کہ سب ایک دستر خوان پر کھاتے ہوں گے تو وہ دستر خوان کتنا بڑا ہوگا۔"

(مضمون "دبگھی کے پیچھے چھوکرا" مشمولہ رسالہ "صبا" حیدرآباد دکن : نومبر ۱۹۵۷ء : صفحہ ۱۸)

ابتدائی تعلیم : مخدوم نے ناظرہ قرآن کے ساتھ گھر ہی پر عربی اور فارسی پڑھنی شروع کی۔ گھر میں سب قرات سے تلاوت کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے تجوید نہیں سیکھی۔ تلنگی گاؤں کے ماحول میں یوں ہی آگئی تھی۔ جب گاؤں کے اسکول میں داخلہ لیا تو تلنگی باقاعدہ پڑھی۔ مندر کے پیپل کے درخت کے نیچے سرسرتی لکھا کرتے تھے۔ انھیں خطاطی کی مشق بھی کروائی جاتی تھی۔ وہ تختیاں اور وصلیاں لکھا کرتے تھے اس لئے ہمیشہ خوش خط رہے۔

وہ باقاعدہ اور بہتر تعلیم حاصل کرنے کے لئے حیدرآباد گئے۔ اپنے رشتے کے ایک چچا کے یہاں قیام کیا۔ اس زمانے کی یادیں انھوں نے اپنے مضمون "دبگھی کے پیچھے چھوکرا" میں قلم بند کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو وہ دھرم ونت اسکول واقع یاقوت پورہ میں زیر تعلیم تھے۔ مسٹر جوشی ہیڈ ماسٹر اور مولوی جعفر علی کلاس ٹیچر تھے۔ مخدوم موجودہ ہائی کورٹ کی عمارت کے قریب اس محلے میں رہتے

تھے جو "چھپا دروازہ" کہلاتا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مختلف زمانوں میں حضرت امجد اور ڈاکٹر زور بھی اسی محلے میں رہا کرتے تھے۔ چھپا دروازہ سے دھرم ونت اسکول کا فاصلہ دو میل ہوگا۔ اس عمر میں مخدوم ہر روز یہ مسافت پیدل طے کرکے اسکول جاتے اور واپس آتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ گھر کے باہر بیٹھے ہائی کورٹ کی عمارت کی تعمیر کے کام کو بڑے انہماک سے دیکھا کرتے۔ وہ زیادہ عرصہ شہر میں نہیں رہے۔ انھیں واپس جانا پڑا اور دیہی اسکولوں میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا پڑا۔

مخدوم نے ۱۹۲۹ء میں سنگا ریڈی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور اسی سال چیلہ پورہ (شہر حیدر آباد) کے شبینہ اسکول سے منشی کا امتحان دیا اور امتیازی نشانات حاصل کیے۔

مطالعے کا شوق : انھیں ابتدا ہی سے مطالعہ کا شوق تھا۔ وہ ابھی ہائی اسکول میں پڑھتے تھے کہ انھوں نے سکندر نامہ، دیوان حافظ، دیوان صائب، اخلاق محسنی، مثنوی مولانا روم کا کچھ حصہ، سعدی کی گلستان اور بوستان ختم کرلی تھیں۔ گھر والوں سے چوری چھپے عبد الحلیم شرر کے ناول بھی پڑھتے تھے۔ علامہ شبلی کی تمام کتابوں کا مطالعہ کرلیا تھا۔ سر سید کی آثار الصنادید اور حالی کی تصانیف بھی زیر مطالعہ رہ چکی تھیں۔ مطالعہ کے شوق نے ان میں صحت زبان، شعری آہنگ اور ادب عالیہ کے اوصاف کا شعور پیدا کردیا تھا۔ روز بروز ادب سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ اس زمانے کے معیاری اور مقبول رسالے مثلاً نگار اور ایوان باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ کالج کے ابتدائی دنوں میں خصوصیت سے شاعری کا مطالعہ کیا۔ نریش کمار شاد کو جو انٹرویو دیا تھا اس میں بتلایا ہے کہ انھیں امیر مینائی کی غزلیں اور عظمت اللہ کی نظمیں بہت پسند تھیں۔ بعد میں میر اور غالب سے بھی متاثر ہوئے۔ اقبال، فانی اور اصغر کے علاوہ حفیظ کے گیتوں اور جوش اور اختر شیرانی کی نظموں کا اثر قبول کیا۔ ان کے جامعہ کے ساتھی مرزا ظفر الحسن نے اعتراف کیا ہے کہ جامعہ کے طالب علم مخدوم کی قابلیت کے قائل تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "مخدوم کا ان دنوں کا علم اس کے دو ایک ساتھیوں کو چھوڑ کر بہت سے اوسط صاحبان علم، سینئر اور جونیئر فرزندان جامعہ اور جامعہ سے ملحقہ

کالجوں کے جونیئر اساتذہ سے زیادہ تھا۔ اردو' فارسی کے کلاسیکی ادب کا نہ
صرف شوق سے مطالعہ کیا اور اس لیے بہت کچھ حاصل کرچکا تھا بلکہ
قدیم اساتذہ سے اسے عشق تھا۔" (عمر گزشتہ کی کتاب : صفحہ ۸۱)

جامعہ کی تعلیم : ریاست حیدر آباد کے متوسط اور نچلے طبقوں کے نوجوان میٹرک کامیاب کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہوجاتے تھے تاکہ خاندان کو معاشی سہارا فراہم کرسکیں۔ اعلیٰ تعلیم کا رجحان عام نہیں تھا۔ مخدوم نے ماحول کے برخلاف اور وسائل کے فقدان کے باوجود تعلیم جاری رکھنے کا عزم کیا۔ وہ جوئے کم آب بن کر نہیں رہنا چاہتے تھے۔ ان میں دریائے تند و تیز بن جانے کی امنگ تھی۔ اضلاع میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہیں تھا اس لئے انھیں شہر آنا پڑا۔ جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت تک جامعہ کی موجودہ عمارتیں تعمیر نہیں ہوئی تھیں۔ شہر میں کرایہ کی کوٹھیوں میں کلاسیں ہوتی تھیں۔ اسی طرح کرائے کی کوٹھی میں ہاسٹل قائم کیئے گئے تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں ان کے اختیاری مضامین اردو' فارسی اور معاشیات تھے۔ انگریزی اور دینیات لازمی مضامین تھے۔ انٹرمیڈیٹ میں ان کا ایک سال ضائع ہوا۔ وہ نہایت شوخ و شریر تھے۔ دینیات کی کلاسیں مولانا احسن گیلانی لیتے تھے۔ کسی وجہ سے ان سے یہ کلاس لے لی گئی۔ ان کی جگہ مولوی عبد المقتدر پڑھانے لگے۔ ان کا حلیہ' لباس اور طریقہ تعلیم طلبہ کی نظر میں مضحکہ خیز تھا۔ لڑکے ان سے الٹے سیدھے سوال کرتے۔ وہ جواب نہ دے پاتے اور جھنجلاتے۔ لڑکے اس سے محظوظ ہوتے اور پے درپے سوالات کرتے۔ سوال کرنے والوں میں مخدوم پیش پیش رہتے تھے۔ جب امتحان کے فارم جمع کرنے کا وقت آیا تو مخدوم اور ان کے پانچ چھ ساتھیوں کو یہ کہہ روک دیا گیا کہ ان کی حاضریاں ساٹھ فیصد سے کم ہیں۔ یوں مولوی صاحب نے شریر شاگردوں کو سزا دی تھی۔ مخدوم نے ہرچند کوشش کی کہ کسی طرح امتحان دینے کی اجازت مل جائے۔ کبھی امید بندھ جاتی تو پڑھتے اور جب ناامید ہوتے تو کتابیں پٹخ کر گھومنے نکل جاتے۔ اس صورتحال میں وہ اپنے ساتھیوں کے مطالعے میں مخل نہیں ہوئے۔ بالاخر انھیں امتحان دینے کی اجازت نہیں ملی۔

مخدوم کو اسکاؤٹنگ سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ اور یحییٰ صدیقی (جو بعد میں ڈپٹی

پولیس کمشنر ہوئے) ایک ہی ٹروپ میں تھے۔ اسکاؤٹنگ کے سلسلے میں وہ میسور بھی گئے تھے جہاں مقابلے میں ان کی چوتھی پوزیشن رہی۔ اچھی کارکردگی کے باوجود خراب پوزیشن کی وجہ یہ تھی کہ سوالات کے جوابات کتاب کے الفاظ کی ترتیب میں نہیں دیے گئے تھے۔

مالی پریشانی : مخدوم جامعہ عثمانیہ میں داخلہ کے لئے جب حیدر آباد آئے تو ان کا قیام اپنے رشتے کے چچا کے پاس تھا۔ کچھ عرصہ انھوں نے کفالت کی۔ بعد میں وہ دست کش ہوگئے۔ ایسے میں مخدوم کے لئے نہ رہنے کے لئے چھت تھی اور نہ دو وقت کی روٹی کا سہارا۔ اس وقت بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ کئی کئی وقت کے فاقے گزرے۔ سلطان بازار کی ہری مسجد میں شب بسری کرتے تھے۔ پیسے ہوتے تو سستی سی ہوٹل میں کھانا کھالیتے' نہ ہوتے تو خالی پیٹ پڑے رہتے۔ اس صبر و ضبط' تحمل اور برداشت کے ساتھ عزت نفس کا اتنا خیال کہ عزیز ترین دوست سے مانگنا تو در کنار' کبھی ان پر حالت زار کا انکشاف بھی نہ ہونے دیا۔

نیم فاقہ کشی کے اس دور میں ایک عجیب مشغلہ اور ذریعہ آمدنی ہاتھ آگیا۔ ان کے جاننے والوں میں ایک برائے نام پڑھے لکھے نوابزادے تھے جو ایک کرسچن لڑکی کو دل دے بیٹھے تھے۔ آئے دن انھیں انگریزی میں لکھے خطوط کو بھیجنے کی ضرورت ہوتی۔ انھوں نے اس کے لئے مخدوم سے رجوع کیا۔ مخدوم نہ انگریزی کے عالم فاضل' نہ رموز و معاملات عشق سے واقف۔ پھر بھی انھوں نے خطوط لکھ کر دینے کی حامی بھر لی کیوں کہ اس طرح کچھ پیسوں کا آسرا تھا۔ انھوں نے ترکیب یہ نکالی کہ گوئٹے کے عشقیہ خطوط کو نوابزادے کے دل کا ترجمان بنا دیا۔

شادی : بے روزگاری اور نیم فاقہ کشی کے اس دور میں مخدوم کی شادی ۲۲ اگست ۱۹۳۳ء (م ۴ جمادی الاول ۱۳۵۲ھ) روز پنج شنبہ ہوگئی۔ اس کے بارے میں مرزا ظفر الحسن نے لکھا ہے :

"ایک دفعہ (مخدوم) قلاش تھا۔ مسلسل دو روز سے کچھ کھایا نہ تھا۔ یوں ہی رشتے کے چچا سمیع الدین کے گھر گیا' جہاں دختر نیک اختر نے مخدوم کو نحیف و نزار پایا۔ کھانے کے لئے پوچھا تو دو دن کا فاقہ زدہ کس برتے پر

انکار کرتا۔ اس لڑکی نے جلدی سے روٹیاں پکائیں۔ دستر خوان بچھایا اور کھانا پیش کیا۔ بعد کو وہی دختر نیک اختر جس کا نام رابعہ ہے مخدوم کی رفیقہ حیات ہوئی (عمر گزشتہ کی کتاب : صفحہ ۵۶)

رابعہ مخدوم : رابعہ مخدوم بڑی حوصلہ مند بیوی ثابت ہوئیں۔ انھوں نے مخدوم جیسے لاابالی نوجوان اور بعد میں سیاسی مقاصد کے لئے وقف لیڈر کا ساتھ صبر، تحمل، ہمت، حوصلے، استقامت، محبت، وفا اور جانثاری کے ساتھ دے کر ایک عظیم مثال قائم کی ہے۔ زندگی کے ہر نشیب و فراز میں انھوں نے مخدوم کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی شب و روز کی مصروفیات کے دوران حقیقی معنوں میں خاندان کے سربراہ کا فرض ادا کیا۔ بچوں کی نگہداشت، ان کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ انھوں نے اٹھایا۔ اپنی ذاتی خواہشات اور خاندان کی ضروریات کو شوہر کے سیاسی عزائم کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ تاریخ میں انھیں ایک ممتاز و اعلیٰ مقام ملنا چاہئے۔ بی اماں قابل تعظیم کہ انھوں نے جنگ آزادی میں اپنے بیٹوں کا ساتھ دیا اور چار دیواری سے نکل کر میدان عمل میں آئیں۔ بیگم حسرت موہانی بھی شوہر کے دوش بدوش معرکہ حق و باطل میں شریک رہیں۔ رابعہ مخدوم کا مرتبہ ان سے کم نہیں تھا۔ انھوں نے چار دیواری میں رہ کر شوہر کی خاندانی ذمہ داریاں خود سنبھالیں۔ ان کا خاموش تعاون مخدوم کے اطمینان اور یکسوئی کا باعث رہا۔ مخدوم ہمیشہ ان کی عزت کرتے تھے اور اپنے بچوں کو بھی عزت کرنے کے لئے کہتے تھے کہ انھیں کی قربانیوں اور توجہ سے وہ پروان چڑھے تھے۔

شادی کے بعد جب تک مخدوم کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی وہ اپنے والد کے زیر کفالت رہیں۔ مخدوم کی روپوشی کے زمانے میں یہی صورت حال رہی۔ ان کی اولاد میں ذکیہ اساوری، سعید الدین اور رفیعہ لینتا مخدوم کے طالب علمی کے زمانے میں پیدا ہوئیں۔ سعید الدین کا انتقال کم عمری ہی میں ہوا۔ اس بچہ کی موت پر مخدوم نے نظم "پرسا" لکھی تھی، جو مجلہ عثمانیہ (۱۹۳۸ء) میں شائع ہوئی تھی۔ رفیعہ بھی کم عمری میں چل بسی۔ نصرت محی الدین اور ظفر محی الدین چوتھی دہائی میں پیدا ہوئے۔ یہ سب بچے مخدوم کو "چچا باوا" کہا کرتے تھے۔

تعلیم کی تکمیل : ایک سال ضائع کر کے مخدوم نے ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ ۱۹۳۴ء میں بی۔اے۔ اور ۱۹۳۶ء میں ایم اے! ان کے اساتذہ میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولوی عبد الحق، ڈاکٹر عبد اللطیف، پروفیسر حسین علی خان، ڈاکٹر محی الدین قادری زور شامل تھے اور جامعہ کے بے تکلف دوستوں میں مرزا ظفر الحسن، میر حسن، اشفاق حسین، یحییٰ صدیقی، علی احمد، شہریار کاؤس جی تھے جن کے ساتھ دن رات کے بیشتر اوقات گزارتے۔ بی اے کے آخری سال میں پہنچے تو وحدت منزل ہاسٹل ہی میں داخلہ لے لیا تھا۔ غالباً اسی زمانے میں مخدوم حسین الیکٹریکل انجینئر نے ان کی مالی اعانت کرنا شروع کردی تھی۔ ہاسٹل میں وہ تھے تو جونیئر لیکن سینئر بھی ان سے پناہ مانگتے۔ جتنی شرارتیں ہوتیں، دھما چوکڑی مچتی اس میں وہی پیش پیش رہتے۔ ان کے ساتھیوں نے اس وقت کی یادیں الگ الگ مرتب کی ہیں جن میں مخدوم نت نئی شرارتوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

تصنیف و تالیف کا آغاز : مخدوم جامعہ کی زندگی کے دوران میں بہت سے خوشگوار اور ناخوش گوار تجربات سے گزرے، مصائب کی ایسی آگ میں جلے جس نے انھیں جلا کر بھسم نہیں کردیا بلکہ کندن بنا دیا۔ فاقہ زدگی کے دور سے گزرے، معاشرے کی محروم اکثریت کے درد سے آشنا ہوئے تو زندگی انھی محرومیوں کے درد کے سہارے صرف کردی۔ آزمائش کی گھڑیوں سے گزرے تو فقیر بے نوا بننا گوارا نہ کیا۔ زندگی نے سبق دیا کہ خودی نہ بیچ! مطالعہ کی وسعت نے ذہن کو جلا دی۔ اس نے احساس دلایا کہ پہلے اپنی ذات کا کھوج لگاؤ اور پتہ کرو کہ کونسی پوشیدہ صلاحیت ہے جو تمھیں نابغہ روزگار بنا سکتی ہے۔ مخدوم اسی کھوج کی منزلوں سے گزرے۔ پہلے نثر نگاری اختیار کی تو "گوئٹے کے خطوط" مرتب کر کے "مجلّہ مکتبہ" میں ۱۹۳۱ء میں شائع کروائے۔ ٹیگور سے متاثر ہوئے تو "ٹیگور اور ان کی شاعری" تصنیف کی جسے ۱۹۳۵ء میں ادارہ ادبیات اردو نے شائع کیا۔

ڈرامہ سے دلچسپی : مخدوم کو ڈرامے سے خاص دلچسپی رہی۔ اس زمانے میں وہاں کے کالجوں اور اسکولوں کی سالانہ تقاریب طالب علموں کے پوشیدہ جوہر عیاں کرنے کے موقع فراہم کرتی تھیں۔ بازاری ناچ گانا ڈرائی پروگرام کے نام سے نہیں

ہوتا تھا اور نہ اسے "ثقافت" کا نام دیا گیا تھا۔ ان مواقع پر طلبہ اپنی متنوع صلاحیتوں کا بھرپور مظاہر کرتے تھے۔ ان کی تفریحات میں بھی تعمیری عنصر غالب ہوتا تھا۔ عموماً ڈرامے پیش کئے جاتے جسے طالب علم خود لکھتے، ہدایات دیتے، کردار ادا کرتے۔ لڑکیوں کے اسٹیج پر آنے کا "فیشن" نہ ہوتا۔ لڑکے ہی نسوانی کردار ادا کرتے اور وہ بھی اس خوبی سے کہ امتیاز کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ایک عرصے تک مرزا ظفرالحسن نسوانی کردار کے لئے مخصوص رہے۔ مخدوم کو ڈرامے سے دلچسپی اسی زمانے میں پیدا ہوگئی تھی جب وہ انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ انھوں نے پہلی بار ڈراما "کالج کے دن" میں کردار ادا کیا۔ یہ ڈرامہ ایک سینئر طالب علم عزیز احمد کا لکھا ہوا تھا جو بعد میں ناول نگار اور نقاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ڈراما ۱۹۳۱ء میں اسٹیج ہوا۔ اس کا موضوع مخلوط تعلیم تھا۔ اس کے تین ایکٹ میں چھ سین اور چودہ کردار تھے۔ جن میں نسوانی کردار بھی شامل تھے۔ مخدوم' وحید کے رول میں پہلی بار اسٹیج پر آئے اور حقیقی رنگ میں اپنا رول ادا کیا۔ مرزا ظفرالحسن آرورا (ہیروئن) کے روپ میں جلوہ گر ہوئے۔ ان دونوں کو بہترین اداکاری کے انعام دیئے گئے۔

اسی سال فرحت منزل (ہاسٹل) کے طالب علموں نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا ڈرامہ "ہمزاد" تیار کرکے گرامر اسکول کے اسٹیج پر پیش کیا۔ اس میں یحیٰ صدیقی نے نواب' مرزا ظفرالحسن نے نواب بیگم' مخدوم نے ملازم (وزیر) اور نقی علی نے عامل کے کردار ادا کئے۔ مخدوم نے بے ساختہ مزاحیہ اداکاری کی وجہ سے بے حد داد پائی۔

۱۹۳۰ء میں "انجمن ترقی ڈراما" قائم ہوئی۔ دکن کے مشہور شاعر مرزا شکور بیگ اس کے معتمد تھے۔ مخدوم بھی اس سے منسلک رہے۔ انجمن کے زیر اہتمام فضل الرحمٰن کے دو ڈرامے "ظاہر و باطن" اور "حشرات الارض" اسٹیج ہوئے۔ مخدوم نے ان دونوں ڈراموں میں کام کیا۔ وہ "ظاہر و باطن" میں لالہ گوبری رام مہاجن بنے تھے۔ ان کا حلیہ اس طرح کا تھا کہ کرتا دھوتی پہنے' گلے میں ریشمی رومال ڈالے جس کے دونوں سرے سینے پر لٹکے ہوئے' سر پہ مارواڑی پگڑی' مکالموں کی ادائیگی بالکل مہاجنوں کے لب و لہجہ میں۔ کردار کو مخدوم نے اس خوبی سے پیش کیا کہ بقول مرزا شکور بیگ "اندیشہ ہوچلا تھا کہ عملی زندگی میں وہ یہی دھندا نہ شروع

بردیں۔" مخدوم نے اس روپ میں تمسخر کے ذریعہ مہاجن طبقہ سے تنفر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

انجمن ترقی ڈرامہ نے "حشرات الارض" ایکسلیر جھیٹر (جو بعد میں ساگر ٹاکیز کہلایا) میں اسٹیج کیا تھا۔ مخدوم، مولوی خیر الامور مالک مطبع بنے تھے۔ ان کے سر پر سفید نقشین کام کی ٹوپی، جسم پر مہین ململ کا انگرکھا، ٹھوڑی کی حد تک سفید داڑھی، لبس غائب، آنکھ میں سرمہ، ناک کی پھنگ پر عینک دیکھ کر لوگ محظوظ ہوئے۔ اس پر خاص لہجہ میں مکالمہ کی ادائیگی اور ہر مکالمہ کے ساتھ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کا کہنا "صاحبزادے! یہ بال میں نے دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں" ناظرین کے لئے خاص تفریح طبع کا سامان تھا۔

۱۹۳۴ء میں ادارہ ادبیات اردو کے لئے امدادی شو کیا گیا۔ اس موقع پر یہ جدت کی کہ عمر خیام کی رباعیات کے ٹیبلو پیش ہوئے۔ فارسی رباعیات مخدوم نے اپنے انداز اور لحن میں پس پردہ پڑھیں۔ ان کا انگریزی ترجمہ پدمجا نائیڈو نے سنایا۔ یہ اتنا دلکش پروگرام تھا کہ دیکھنے والوں کو برسوں یاد رہا۔ ٹیبلو کے بعد مرزا ظفر الحسن کا ڈرامہ "طبیب حاذق" پیش کیا گیا۔ اس میں مخدوم نے دولت مند زمیندار کے بھتیجے کا کردار کیا اور خوب داد پائی۔

دسمبر ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ کی سالانہ تقریب منعقد ہوئی۔ میر حسن اور مخدوم نے مشترکہ کوشش سے جارج برناڈ شا کے ڈرامہ "وڈورس ہاؤس" کے مرکزی خیال پر مبنی ڈرامہ "ہوش کے ناخن" تحریر کیا۔ کہانی کو اس مہارت سے اخذ کیا گیا تھا کہ اس پر ترجمہ کا گمان نہ ہوتا تھا بلکہ تخلیق کا شبہ ہوتا تھا۔ ڈرامہ نگاری کے حوالے سے مخدوم کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اسے لیاقت منزل (ہاسٹل) میں اسٹیج کیا گیا۔ ڈرامہ کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ملازم کے مکالمے ٹھیٹ دکنی زبان میں تھے۔ اس میں یحیٰی صدیقی (سید غضنفر علی)، مرزا ظفر الحسن (میر صاحب کی صاحبزادی، بلقیس)، لطیف (بلقیس کی خادمہ، شب رنگ)، جمیل فاروقی (ملازم، بندہ علی)، عباس علی خان (نوجوان ڈاکٹر شمشاد)، مخدوم (ڈاکٹر شمشاد کے دوست، قاری عبد العزیز) نے اداکاری کی۔ یہ ایک مسائلی کھیل تھا جس میں دکن کے معاشرے کی جھلکیاں پیش کرتے ہوئے ان پر

طنز کیا گیا تھا۔ ڈرامہ دیکھنے والوں میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، مسز سروجنی نائیڈو، مہاراجہ کشن پرشاد، سر اکبر حیدری بھی شامل تھے، وہ سب مخدوم کے حلئے اور بے ساختہ مزاحیہ اداکاری سے بے حد محظوظ ہوئے اور اداکاری کا پہلا انعام بھی مخدوم نے حاصل کیا۔

(ڈرامہ "ہوش کے ناخن" ۱۹۳۵ء میں ادارہ ادبیات اردو نے کتابی صورت میں شائع کیا)

ڈراموں میں اداکاری کرتے ہوئے مخدوم کی تخلیقی صلاحیت جاگی اور انھیں ڈرامہ نگاری پر مائل کیا۔ "مرشد کامل" پہلا ڈرامہ تھا جسے انھوں نے بغیر کسی کے اشتراک کے تحریر کیا۔ ۱۹۳۵ء میں اسے "کالج ڈے" کے موقع پر پیش کیا جانا تھا مگر امتناعی حکم کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ اس بارے میں مجلّہ عثمانیہ کے انگریزی حصے میں "کالج نیوز" کے تحت لکھا گیا تھا کہ :

> اس سال مسٹر مخدوم محی الدین کا دو ایکٹ کا ڈرامہ "مرشد کامل" "یونیورسٹی ڈے" کے موقع پر پیش ہونا طے ہوا تھا۔ مسٹر مرزا ظفر الحسن (سابق پریسیڈنٹ اکنامک ایسوسی ایشن)، سکریٹری ڈرائنگ سوسائٹی عثمانیہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کو اس وقت شدید صدمہ ہوا جب جامعہ کے صاحبان اقتدار نے اس آئٹم کو اچانک منسوخ کر دیا"۔
>
> (مجلّہ عثمانیہ بابت ۱۹۳۵ء : صفحہ ۴۹، حصہ انگریزی)

مرزا ظفر الحسن نے بیان کیا ہے یہی ڈرامہ طلباء کی تنظیم "عثمانین" نے کوئٹہ کے زلزلہ کے متاثرین کی امداد کے لئے ایکسلسیر تھیٹر میں اسٹیج کیا تھا۔ اس تقریب میں شہزادہ اعظم جاہ مہمان خصوصی تھے۔ انھیں کی زبانی نظام سابع نواب میر عثمان علی خان کو اس پروگرام کی خبر ہوئی تو انھوں نے بھی شرکت پر آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ وہ مولانا شوکت علی اور خواجہ حسن نظامی کی معیت میں تشریف لائے اور ڈرامہ کے دوران مسرور بھی ہوئے۔ اس میں مخدوم نے "مرشد کامل" کا کردار ادا کیا تھا۔ اتفاقاً ان کا حلیہ خواجہ حسن نظامی سے مشابہ تھا۔

مخدوم نے چیخوف کے ڈرامے "چیری آرچرڈ" کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا

جسے "پھول بن" کے نام سے زمرد محل ٹاکیز کے اسٹیج پر پیش کیا۔ ڈرامہ کامیاب ثابت نہ ہوا اور اسی کے ساتھ مخدوم نے اداکاری کو خیرباد کہہ دیا۔

مخدوم ایک بے باک نوجوان تھے۔ اسی لئے تمام ڈراموں میں بے جھجک ایسی اداکاری کی کہ پیشہ ور اداکار بھی مشکل سے کر سکیں۔ وہ نہایت جاندار مزاحیہ کردار ادا کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اپنی فطری اداکاری اور مکالموں کی برجستہ ادائیگی سے سماں باندھ دیتے تھے۔ ان کی ہر حرکت دیکھنے والوں کو گدگدیاں کرتی تھی۔ ہال قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔ مخدوم کا اداکاری کا شوق ۱۹۳۱ء سے شروع ہو کر طالب علمی کے دور کے اختتام تک جاری رہا۔ وہ شخص جو مصائب اور محرومیوں سے دوچار تھا اپنی حالت کی پروا کئے بغیر لوگوں میں مسکراہٹیں، قہقہے، مسرت اور انبساط کے خزانے لٹاتا رہا۔ یہ اس کی بلند حوصلگی، اعلیٰ ظرفی اور انسان دوستی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

اسٹیج کو خیرباد کہنے کے بعد انھوں نے ایک طبع زاد ڈرامہ "پاپن" تحریر کیا جو شائع بھی ہوا۔ مخدوم نے ڈرامے کے دونوں شعبوں یعنی تحریر اور پیشکش میں اپنی ماہرانہ صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ ڈرامہ سے اس دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے ایم اے میں مقالہ کا موضوع بھی یہی منتخب کیا یعنی "اردو ڈرامہ اور اسٹیج کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ!" اسی سلسلے کے دو مضامین "اندر سبھا سے پہلے" اور "اردو ڈرامہ کا جدید دور اور حیدرآباد" مجلہ عثمانیہ میں شائع ہوئے تھے۔

شاعری کی ابتدا : حالات اور شواہد بتلاتے ہیں کہ مخدوم اتفاقیہ طور پر شاعر بن گئے تھے۔ انھوں نے نہ علم عروض سے آگاہی حاصل کی تھی اور نہ کسی سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ کی شوخی و شرارت ان کی نظم "پیلا دوشالہ" کی محرک بنی۔ اس کی شان نزول کی تفصیلات ہاسٹل کے کمرے کے ساتھی نے یوں تحریر کی ہیں :

"ہاسٹل میں نئے آنے والوں کو برادری میں شامل کرنے کی تقریب کے سلسلے میں جب ایک نووارد کا بستر چھپا دیا گیا تو اس نے بڑے دکھی لہجے میں کہا کہ اسے بستر کا غم نہیں البتہ اس میں ایک دوشالہ تھا جو مل جاتا تو باقی بستر سے دست بردار ہونے کو تیار تھا۔ یار لوگوں کو شغل ہاتھ آگیا۔

اس دوشالہ کی یاد میں مجلسیں برپا کی گئیں۔ تعزیتی قراردادیں پاس ہوئیں اور مخدوم نے مرثیہ لکھا جس کو "پیلا دوشالہ" کے نام سے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مرثیہ کے بعد مخدوم اور ان کے احباب پر مخدوم کی شاعرانہ صلاحیتوں کا انکشاف ہوا"

(یحییٰ صدیقی : مضمون "اقامت خانے میں" مشمولہ رسالہ صبا' مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء : صفحہ ۱۷۶)

ڈراموں میں اداکاری کرکے مخدوم کو جو شہرت حاصل ہوئی تھی "پیلا دوشالہ" نے اسے کئی گنا بڑھا دیا۔ اگرچہ اس کی اشاعت کی نوبت مدت تک نہیں آئی' وہ ہر خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئی۔ پہلے دو ہاسٹلوں مسرت منزل اور نظامت منزل کے لڑکوں نے انھیں بلوا کر نظم سنی۔ پھر یہ یونیورسٹی پہنچی۔ وہاں سے شہر کے کالجوں' اسکولوں' نجی محفلوں اور گھروں میں سنائی اور گائی جانے لگی۔ زندہ دلان حیدر آباد نے اسے سینہ بہ سینہ پھیلا دیا اور محفوظ رکھا۔ صفحات ما قبل میں ذکر کیا گیا کہ ۱۹۳۰ء میں کوئٹہ کے زلزلے کے متاثرین کی امداد کے لئے ایک شو کیا گیا تھا۔ اس میں ڈرامہ "مرشد کامل" سے قبل اسی نظم کو قوالی کے طور پر پیش کیا گیا۔ دکنی زبان کے معروف شاعر غلام علی (علی میاں) مرشد بن کر بیٹھے ہاتھ میں تسبیح' سر پر زریں عمامہ' شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے مریدوں اور عقیدت مندوں میں گھرے ہوئے' مخدوم اسٹیج پر آئے نظم کا پس منظر بیان کیا اور پھر قوالی شروع ہوئی جس کے دوران مرشد کو بار بار حال آتا۔ وہ نعرہ تحسین بلند کرتے' سر دھنتے' کبھی کھڑے ہو کر مستانہ وار جھومتے۔ جس مصرع پر انھیں حال آتا اس کی تکرار اس وقت تک جاری رہتی جب تک کہ ان پر یہ کیفیت طاری رہتی۔ جب اس مصرع پر پہنچے "وہ کون بلاوڑ تھا جو چٹ کر گیا تجھ کو" تو مرشد بری طرح بے حال ہوگئے۔ "بول! پھر بول!! بلاوڑ بول!!! بولے جا! بولے جا!" کی آوازیں لگاتے رہے۔ قوال مصرع دہراتے رہے اور ہر بار ان کے جوش اور آہنگ میں اضافہ ہوتا رہا۔ مجمع پر قہقہوں کا دورہ پڑا کہ تھمنے کا نام نہ لیتا۔ نظام سابع' سر اکبر حیدری' مولانا شوکت علی اور خواجہ حسن نظامی جیسے ثقہ بمشکل ہنسی ضبط کر پا رہے تھے۔ قوال جب اس آخری شعر پر پہنچے :

او گرم کن پہلوئے من بازیبائی گریم زجدائی
آں روز بیا و آر کہ من زیر تو بالا او پیلا دوشالہ

تو مرشد نے ایک فلک شگاف چیخ سے داد دی اور کہا "اردو میں بول! اردو میں بول!" پیلا دوشالہ کے چرچے جب عام ہوئے تو مولوی عبد الحق نے بطور خاص مخدوم کو طلب کرکے اسے سنانے کی فرمائش کی۔ اسے سن کر خوش ہوئے اور بے حد تعریف کی۔ خلیفہ عبد الحکیم نے بھی اسے سنا۔ "من زیر و تو بالا" کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس سے بہتر استعمال میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور کے طالب علموں میں مذاق سلیم کی فراوانی تھی اور استادوں میں شفقت بزرگانہ کی۔ وہ اپنے شاگردوں کی حوصلہ افزائی سے کبھی گریز نہیں کرتے تھے۔

انھیں دنوں علیگڑھ کی کرکٹ ٹیم حیدر آباد آئی تھی۔ زاہد سعید لودھی اس کے کپتان تھے اور وزیر علی بھی اس ٹیم میں شامل تھے۔ انھیں فرحت منزل (ہاسٹل) میں ٹھہرایا گیا تھا۔ تعارفی تقریب میں مخدوم نے یہی نظم اپنے مخصوص انداز اور ترنم میں سنائی۔ ٹیم کے کھلاڑی ایک ایک مصرع پر جھوم جھوم گئے۔ وزیر علی نے اس کی دھن ماؤتھ آرگن میں سنائی۔ یہی تقریب مخدوم اور وزیر علی کی دوستی کی بنیاد ثابت ہوئی۔ پھر تو ہر شام محفل جمنے لگی۔ مخدوم خود ساختہ لطیفے سناتے۔ وزیر علی اپنے تجربات بیان کرتے۔ مخدوم غزل خواں ہوتے اور وزیر علی ماؤتھ آرگن پر اس کی دھن بجاتے۔

جامعہ عثمانیہ میں مخدوم کی مقبولیت کا ایک سبب ان کی خوش مزاجی اور لطیفہ گوئی بھی تھا۔ فقرا بازی، جملے کسنے، برجستہ جملے لگانے، لطیفے ایجاد کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ جس محفل میں پہنچ جاتے اسے زعفران زار بنا دیتے۔ باغ عامہ کے مہتمم جمال الدین کا نام استعمال کرتے ہوئے ان کے گڑھے ہوئے لطیفے آن کی آن میں مشہور ہوجاتے۔ بعض اوقات بے تکلف احباب کے مجمع میں وہ معیار آداب کے تمام حدود پار کرجاتے۔

انھوں نے ایک بار "اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ" کا الیکشن بھی لڑا۔ لیکن اپنی بے پناہ مقبولیت کے باوجود کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ الیکشن لڑنے کے داؤ پیچ سے وہ واقف نہ تھے۔ ان کا مقابلہ ایک سنجیدہ مزاج، خاموش فطرت کارکن جی ایم خان سے تھا۔ وہ

الیکشن میں کامیاب ہونے کے گر سے وہ واقف تھے۔ مخدوم کے مقابلے میں وہ ہی کامیاب ہوئے اور تکمیل تعلیم کے بعد برسا برس "بلدیہ حیدر آباد" کا انتخاب بھی جیتتے رہے۔ ان کے حلقے میں کوئی انھیں ہرا نہ سکا۔

(بی ایم خان رسالہ "ہندوستانی ادب" شائع کرتے تھے اور املا کو بول چال کے مطابق رکھنے کے سب سے بڑے علمبردار تھے)

مخدوم نے جامعہ عثمانیہ میں سات سال ایک تیز و طرار، خوش طبع، بذلہ سنج، جملے باز، لطیفہ گو اور کھلنڈرے نوجوان کی طرح گزارے۔ ان کا ظاہر ان کے حقیقی حالات کا پردہ پوش رہا۔ انھوں نے ۱۹۳۴ء میں بی اے اور ۱۹۳۶ء میں ایم اے کیا اور اس کے بعد جامعہ کو خیر باد کہہ دیا۔

طالب علمی کے دور کے خاتمہ کے بعد بے روزگاری کے عفریت سے پالا پڑا۔ وہاں بھی قابلیت کے مقابلہ میں سفارش کا چلن تھا اور مخدوم اس معاملہ میں تہی دست تھے۔ وہ خوشامد سے سفارش حاصل کرنے کے بجائے معمولی اور جز وقتی نوکری پر گزارہ کرتے۔ ایک بار معتمدی امور اصلاحات میں کلرکی کی۔ ان کے جامعہ کے ساتھی شہاب الدین بھی اسی محکمہ میں ملازم تھے۔ محکمہ کے معتمد نواب یوسف یار جنگ تھے۔ بڑے سجیلے، خوبرو، نفاست پسند! شہاب الدین بھی اپنی جگہ نفیس یار جنگ تھے۔ شیروانی نفیس، قمیص، ٹوپی نفیس، جوتا نفیس اور سیکل نفیس، مگر مخدوم کا معاملہ بالکل الگ تھا۔ وہ ہمیشہ کا پھٹیچر الدولہ تھا۔ ٹوپی پر میل، شیروانی کا کالر پھٹا ہوا، کمربند میں ایک گرہ تو جوتے کی ڈوری میں چار چار، قمیص کے بٹن ٹھیک تو آستین کے بٹن ٹوٹے ہوئے۔ کوئی اپنی خو چھوڑے نہ چھوڑے، مخدوم اپنی وضع بدلنے والا نہ تھا۔ ایک کیا بیک وقت کئی عدد یوسف یار جنگ بھی ہوتے تو مخدوم مخدوم ہی رہتا۔ چنانچہ اس نے نوکری چھوڑی اپنی وضع نہیں چھوڑی۔"

(مرزا ظفر الحسن : ذکر یار چلے : صفحہ ۱۷۸)

نشر گاہ حیدر آباد کے ابتدائی دنوں میں مخدوم نے وہاں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔ تنخواہ ساٹھ روپے ماہانہ تھی وہ بھی زیادہ عرصہ نہ نبھی۔ اس طرح وقت گزرتا گیا۔ مخدوم عمر کی اس حد کو چھونے والے تھے جس کے بعد سرکاری ملازمت شجر

ممنوعہ ہوجاتی کہ سٹی کالج کے استاد' مخدوم کے ساتھی میر حسن کی خدمات نشرگاہ حیدرآباد کے لئے حاصل کرلی گئیں۔ انھوں نے اپنی جگہ مخدوم کو ملازمت دینے کی درخواست کی جو کالج کے پرنسپل اعظم صاحب نے قبول کرلی۔ میر حسن نے پرنسپل سے درخواست کرتے ہوئے اپنی بذلہ سنجی کا مظاہر کیا۔ اپنے گورے اور مخدوم کے کالے رنگ کے مد نظر انھوں نے فقرہ کسا تھا کہ "یہ میری ڈارک سائیڈ ہیں"۔ ۱۹۳۹ء میں مخدوم سٹی کالج کے ہائی اسکول سیکشن میں اردو کے معلم ہوگئے۔ اگرچہ ملازمت اور تنخواہ ان کی ڈگری اور قابلیت کے برابر نہ تھی' لیکن بے روزگاری کے مارے ہوئے کے لئے یہ بھی بہت تھا۔ اکثر اہل قلم نے مخدوم کو سٹی کالج کا لکچرار اور پروفیسر لکھا ہے جو قطعی خلاف واقعہ ہے۔ راقم الحروف اسی زمانہ میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اپنے مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہے کہ وہ ہائی اسکول میں مدرس تھے۔ ان کے پڑھانے کے انداز کا ذاتی علم نہیں لیکن سنا ہے کہ وہ نصاب پر کم توجہ دیتے تھے اور ادب و شاعری کو وسیع تناظر میں متعارف کرواتے تھے۔ مشاہدہ میں یہ بھی آیا کہ دیگر اساتذہ کی طرح وہ طلبہ سے الگ تھلگ نہیں رہتے تھے۔ فارغ اوقات بالخصوص دوپہر میں کھانے کے وقفے کے دوران وہ اعظم ہال کی اوپری منزل میں بالکونی کے قریب طلبہ کا مجمع لگائے دنیا جہاں کی باتیں بتلایا کرتے تھے جن کا تعلق زیادہ تر سیاست' تاریخ اور تہذیب سے ہوتا تھا۔ ان کی خاص وضع قطع تھی۔ لمبے لمبے بال جو شیروانی کے کالر کو چھپائے رکھتے' گہرے نیلے رنگ کی شیروانی جو جامعہ عثمانیہ کے دنوں کی یادگار تھی' کیوں کہ یہی جامعہ اور کالج کے طالب علموں کا یونیفارم تھا۔ ظاہری حالت سے نمایاں تھا کہ شیروانی نے زمانے کے بہت گرم و سرد جھیلے ہیں لیکن کبھی دھوبی کا منہ نہیں دیکھا۔ ان کے لمبے بالوں کے پسینے اور میل سے کالر آلودہ' بغل میں کتابیں کم اور اخبارات زیادہ' خصوصاً ریاست سے باہر کے اخبارات۔ ان کے اثر سے طالب علموں اور شہر کے نوجوانوں میں دو باتیں عام ہونے لگیں۔ ایک بڑے بال رکھنا اور دوسرے دل لگا کر اخبارات پڑھنا۔ اپنی ظاہری ابتر حالت کے ساتھ ان میں ایک انداز بے نیازی بھی تھا۔ اسکول کے طالب علم اس ادا کو کوشش کے باوجود نہیں اپنا سکے۔ یہ مخدوم کی شخصیت کی مقناطیسیت تھی کہ اس دور میں بھی جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھے طالب

علم ان کی طرف کھنچے جاتے تھے۔

اشتراکیت اور مخدوم : مخدوم کی ہنس مکھ، خوش دل اور کھلنڈری ہستی کی ذات میں ایک سنجیدہ فکر پروان چڑھ رہی تھی۔ انھوں نے خوشیاں کم پائی تھیں۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ خوشیاں بانٹتے پھریں۔ ہر ہر فرد کے دامن کو مسرتوں اور شادمانیوں سے بھر دیں کہ اس کے دل میں کوئی غم، کوئی کسک باقی نہ رہے۔ ان کے اطراف کوئی بھوکا نہ رہے، کوئی نیم برہنہ نہ رہے۔ انھیں چچا بشیر الدین کی باتیں یاد تھیں کہ "انقلاب کے بعد روس میں مساوات قائم ہو گئی ہے وہاں ایک ہی دسترخوان پر سب کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی بڑا اور چھوٹا نہیں ہے۔" بچپن کی ان یادوں نے انھیں اشتراکیت کی طرف مائل کیا۔ ان کا بیان ہے کہ ۱۹۳۴ء میں انھوں نے مارکسزم کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ اس وقت انگریز حکمرانوں نے اشتراکیت کا ہوا بنا رکھا تھا۔ برصغیر کی حکومتی مشنری اس کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ لٹریچر اور پارٹی پر پابندی تھی۔ اس کا نام لینا عذاب کو دعوت دینا تھا۔ ریاست حیدر آباد میں صورت حال قدرے مختلف تھی۔ سبط حسین گواہی دیتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی وہاں کمیونسٹ لٹریچر عام بکتا تھا۔ انھوں نے خصوصیت سے "حیدر آباد بک ڈپو" کے بارے میں لکھا ہے کہ :

> "اس دوکان کو دیکھ کر ششدر رہ گیا کیونکہ تارا پور والا کے علاوہ ایسی شاندار دکان پورے ہندوستان میں نہ تھی۔ اسی دوکان پر ہر موضوع کی کتابیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ حیدر آباد میں مارکس، اینگلس، لینن اور دوسرے اشتراکی مصنفوں کی مستند تصانیف اعلانیہ فروخت ہوتی تھیں اور کوئی اعتراض نہ کرتا تھا حالانکہ اس قسم کی کتابیں ہندوستان میں ممنوع تھیں بلکہ ان کا داخلہ بند تھا"
>
> (سبط حسن : شہر نگاراں : صفحہ ۶۷)

مخدوم نے نریش کمار کو انٹرویو دیتے ہوئے بتلایا تھا کہ "۱۹۳۴ء میں مارکسزم کے مطالعہ سے دماغ میں کشادگی پیدا ہوئی اور ۱۹۳۶ء میں کمیونسٹ پارٹی کا رکن بن گیا"۔ ۱۹۳۹ء میں ناگپور کے "کامریڈ گروپ" کی مدد سے مخدوم نے حیدر آباد میں طلبہ تنظیم قائم کی۔ اس سے ان کی عوامی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ آندھرا میں "آندھرا سبھا" قائم

تھی۔ اس علاقے کے نوجوان کمیونسٹ اس میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں [illegible] سبھا کے لیڈر سی راجیشور راؤ اکثر شہر حیدرآباد کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ان [illegible] سے رابطہ ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں بائیں بازو کا رجحان رکھنے والوں نے اپنی تنظیم قائم کرلی۔ مخدوم اس کے پہلے سکریٹری بنے۔ راج بہادر گوڑ اسسٹنٹ سکریٹری بنے۔ وہ خفیہ اور رازدارانہ طور پر اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے رہے۔ ان کی رہنمائی اور تربیت کے لئے جن کو مقرر کیا گیا تھا وہ "حاجی صاحب" کہلاتے تھے۔ ۱۹۴۱ء تک اراکین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مختلف شعبے قائم کردیئے گئے۔ انہوں نے ڈھکے چھپے کام کرنے کے ساتھ کامریڈ ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم کو بھی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ یہ سب نوجوان انتہائی اناڑی تھے۔ اکثر ان سے بھول چوک ہوجاتی' لیکن غنیمت یہ کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئے۔ راج بہادر گوڑ نے اس دور کی ناپختگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک بار ان لوگوں سے کہا گیا کہ ایک قرارداد لکھیں۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس بات پر اور کس طرح قرارداد لکھی جائے۔ ان کے رہنما "حاجی صاحب" باوجود بڑی عمر کو پہنچنے کے غیر شادی شدہ تھے۔ مخدوم نے قرارداد تیار کی جس میں کہا گیا تھا کہ "پارٹی کے کارکنوں کا پر زور مطالبہ ہے کہ حاجی صاحب شادی کرلیں"۔ اس قرارداد پر حاجی صاحب سخت ناراض ہوئے۔ ان نوجوانوں کے خلاف آندھرا پردیش صوبائی کمیٹی کو رپورٹ کردی۔ راجیشور راؤ نے یہ کہہ کر کہ یہ نوجوانوں کی زندہ دلی ہے معاملہ کو رفع دفع کردیا۔

اسی ہنگامہ پرور دور میں مخدوم ۱۹۴۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے اور پارٹی کا کل وقتی کام کرنے لگے۔ وہ اپنے کام کو انتہائی خلوص اور دیانت داری سے ادا کرتے تھے۔ ان کی لگن کا یہ حال تھا کہ جب ناگپور میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس منعقد ہونے والی تھی مخدوم' ہیما دری اور راج بہادر کو بطور ڈیلی گیٹ شریک ہونا تھا۔ روانگی کے روز ان کی چچی کا انتقال ہوگیا۔ آخری رسوم میں ان کا شریک ہونا ضروری تھا۔ ان کے ساتھیوں کو یقین تھا کہ مخدوم ناگپور نہیں جاسکیں گے' لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے مخدوم کو پلیٹ فارم میں داخل ہوتے دیکھا۔ انہوں نے چچی کی آخری رسومات کی ذمہ داری اپنے رشتے کے بھائی نظام الدین کے تفویض

کردی تھی۔ مخدوم اور نظام الدین ایک دوسرے کا بے حد لحاظ کرتے تھے۔ مخدوم کی روپوشی کے زمانہ میں بھی ان کی بیوی بچوں کا خیال نظام الدین نے رکھا۔ ان کے باہمی تعلق کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ مخدوم کے بچے نظام الدین کو ہی "بابا" کہا کرتے تھے اور مخدوم کو "چچا باوا"۔

دوسری جنگ عظیم تباہ کاریوں کے ساتھ مہنگائی کی عفریت کو جنم دینے کا سبب بنی۔ مہنگائی اتنی بڑھی کہ مزدور طبقہ تڑپ اٹھا اور پہلی بار ہڑتال کی لہر دوڑی۔ سب سے پہلے دیوان بہار رام گوپال ملز میں مزدوروں نے ہڑتال کی۔ اس کے بعد آل ون میٹل ورکس، چارمینا سگریٹ بنانے والی وزیر سلطان سگریٹ فیکٹری میں ہڑتال ہوئی۔ ریلوے کے مزدور بھی اس میں شامل ہوئے۔ حیدرآباد، سکندرآباد، اورنگ آباد، ورنگل، گلبرگہ غرض ریاست کا ہر صنعتی علاقہ ہڑتالوں کی لپیٹ میں آگیا۔ نوجوان قیادت نے صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور مزدوروں سے قریب تر ہوتے گئے۔ جب ریلوے ورکرز نے ہڑتال کی اور ان کے تمام لیڈر گرفتار کیئے گئے تو مخدوم نے راج بہادر اور عالم خوند میری کے ساتھ قیادت سنبھال لی اور ان کے مطالبات منظور کروالئے۔ بعد میں مزدوروں نے مخدوم کو ریلوے یونین کا سینئر نائب صدر بنایا۔ مخدوم نے اسکول ٹیچرز کی یونین قائم کی۔ حیدرآباد میں بے شمار چھوٹی چھوٹی بالخصوص بٹن بنانے والی فیکٹریاں تھیں جہاں کے کارکن انتہائی غیر انسانی ماحول میں کام کرتے تھے۔ انھیں برائے نام مزدوری دی جاتی اور کسی قسم کی مراعات حاصل نہ تھیں۔ مخدوم نے ان فیکٹریوں کے مزدوروں کو منظم کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے صرف شہر حیدرآباد سے سو سے زائد ٹریڈ یونین قائم ہوگئیں۔ ان سب میں مخدوم کے نام کا سکہ چلتا تھا۔

۱۹۴۴ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا پر سے پابندی اٹھائی گئی تو بمبئی میں اس کی پہلی کانفرنس کا اہتمام ہوا۔ حیدرآباد سے نمائندگی مخدوم محی الدین اور عابد علی خان نے کی۔

عوام کے محاذ پر آجانے کے بعد مخدوم کی خطابت کے جوہر کھلے۔ ٹریڈ یونین کے اجتماعات کو مخاطب کرتے کرتے وہ جلسوں میں بھی تقریریں کرنے لگے۔ ان کی تقریروں میں جوش و خروش اور بلند آہنگی کم ہوتی۔ دلائل کے ساتھ اپنے موقف کی وضاحت

کرتے لیکن جملوں میں تمسخر اور طنز کی کاٹ بھی ہوتی تھی اور آخر ۱۹۴۴ء میں "قومی ہفتہ" کے موقع پر انھوں نے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "وائسرائے بہادر سمجھتے ہیں کہ وہ دم ہلا ہلا کر جنگ جیت جائیں گے"۔ یہی جملہ لائق مواخذہ بنا۔ ان پر مقدمہ چلا۔ مجسٹریٹ سیادت علی خاں نے انھیں ڈھائی سو روپیہ جرمانے کی سزا دی۔ پارٹی جرمانہ ادا کرنے کے لئے تیار تھی۔ مخدوم نے قبول نہیں کیا اور اس کے بدلے تین ماہ چنچل گوڑہ جیل میں گزارے۔ وہاں بھی ان کی رگ ظرافت پھڑکتی رہی۔ اپنے تند و تیز جملوں سے جیلر کو تنگ کرتے رہے۔ ایک دفعہ کھانے میں مرا ہوا بچھو برآمد ہوا تو انھوں نے جیلر سے کہا "براہ کرم اس بات کا خیال رکھیں کہ کچھ قیدی سبزی خور ہیں"۔ مرزا ظفر الحسن ان سے ملنے کے لئے گئے۔ ملاقات جیلر کی موجودگی میں ان کے کمرے میں ہوئی۔ ظفر الحسن نے پوچھا "فرصت کے اوقات میں کیا کرتے ہو؟" مخدوم نے جواب دیا "کھانے میں ساگ کے نام سے جو چیز ملتی ہے اس کی رسیاں بنا کرتے ہیں"۔ ان کی باتوں پر جیلر تڑپ کر رہ جاتا۔

۱۹۴۵ء میں رہائی کے بعد مخدوم نے حیدرآباد ٹریڈ یونین کانگریس طلب کی۔ حکومت اس کے حق میں نہیں تھی۔ وہ گرفتار کرلئے گئے لیکن عدلیہ سے رجوع کرنے پر آزادی کا حکم ملا۔

ترقی پسند ادب کی تحریک : مخدوم نے جن دنوں مارکسزم کا اثر قبول کیا انھی دنوں میں ترقی پسند ادب کے چرچے عام ہونے لگے تھے۔ سجاد ظہیر تحریک اور تنظیم کے سلسلے میں ہمہ وقت مصروف تھے۔ ان ہی کی کوششوں سے "انجمن ترقی پسند مصنفین" قائم ہوئی تھی۔ وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں تحریک کے حامیوں کو تلاش کررہے تھے۔ حیدرآباد کے لئے ان کی نظر انتخاب سبط حسن پر پڑی جو قاضی عبد الغفار کے اخبار "پیام" سے منسلک تھے۔ سبط حسن اور مخدوم نے حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کرنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ پہلے قاضی عبد الغفار کی اشیرواد حاصل کی اور سرپرستی کے لئے مسز سروجنی نائیڈو کو منتخب کیا۔ وہ انگریزی زبان کی شاعرہ تھیں۔ ریاست اور بیرون ریاست نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ ان کی سرپرستی ایک طرح سے پناہ ثابت ہوسکتی تھی چنانچہ قاضی

عبد الغفار کی قیادت میں سبط حسن اور مخدوم ان کی قیام گاہ گولڈن تھریشولڈ پہنچے۔ سبط حسن نے لکھا ہے :

"میں نے موقع پا کر پدمجا سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور کہا آپ سفارش کردیں۔ یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔ پدمجا نے کہا "ٹھہرو" اور پھر مسز نائیڈو کی بات کاٹ کر بولیں "ممی آپ بولتی چلی جاتی ہیں کسی کی سنتی ہی نہیں۔ یہ لڑکے بے چارے آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں"۔ ہم لوگوں نے جلدی جلدی اپنا مدعا بیان کیا۔ قاضی صاحب نے پرزور الفاظ میں ہماری وکالت کی۔ مسز سروجنی نائیڈو ہماری انجمن کی سرپرست بن گئیں۔ چنانچہ انجمن کا پہلا جلسہ مسز نائیڈو کی کوٹھی پر ہوا۔

(سبط حسن : تھرنگاراں : ص ۹۵)

مسز سروجنی نائیڈو مخدوم سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ انھوں نے ہمیشہ ہر ایک سے مخدوم کا تعارف اپنے بیٹے کے طور پر کروایا۔ ان کی سرپرستی سے حیدرآباد میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے قدم جمائے۔ مخدوم کی مقناطیسی شخصیت نے دنوں میں اسے تحریک کی صورت دے دی۔ ۱۹۴۳ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" باقاعدہ تشکیل پائی۔ افتتاحی جلسے کی صدارت قاضی عبد الغفار نے کی۔ یہ اعزاز اسی انجمن کے حصہ میں آیا کہ اس کے زیر اہتمام پہلی کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح مسز سروجنی نائیڈو نے کیا۔ اجلاس کی صدارت مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تارا چند، فراق گورکھ پوری اور احتشام حسین نے کی۔ بیرون ریاست کے شرکاء میں سردار جعفری، وامق جونپوری، مجاز، پریم دھون اور سجاد ظہیر شامل تھے۔ اگرچہ مخدوم نے یہ پودا لگایا تھا لیکن جب وہ بار آور ہوا تو اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے وہ زیادہ فعال نہیں رہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے "سب رس" کا خصوصی شمارہ شائع کیا جسے عابد علی خان نے مرتب کیا تھا۔

تلنگانہ تحریک : اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ایک مخلص عوامی کارکن کمریا کو زمینداروں کے ایما پر قتل کروا دیا گیا۔ اس بہیمانہ کارروائی کے خلاف احتجاج کی غرض سے "یوم مخالف

ظلم" منانے کا اعلان ہوا۔ حکومت نے تاریخ مقررہ سے قبل تمام مزدور رہنماؤں کے وارنٹ گرفتاری جاری کردئے۔ جیسے ہی اس بات کا علم ہوا سب روپوش ہوگئے۔ مخدوم شاہ آباد میں سیمنٹ کے مزدوروں کی ایک میٹنگ میں شریک ہونے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ انھیں اطلاع پہنچائی گئی کہ وہ فوری شوراپور چلے جائیں اور شہر حیدرآباد میں اس وقت تک نہ آئیں جب تک مناسب انتظامات نہ کرلئے جائیں۔

روپوشی کے زمانہ میں ان کی سیاسی جدوجہد نے نیا رخ اختیار کیا۔ ریاست کا مشرقی علاقہ جہاں تلگو بولی جاتی تھی تلنگانہ کہلاتا ہے۔ یہ ایک نہایت زرخیز خطہ ہے جس پر زمینداروں، جاگیرداروں، دیس مکھوں کا قبضہ تھا۔ کھیت مزدور جان فشانی کے عوض برائے نام معاوضہ پاتے۔ اکثر افراد کی زندگی "ایٹی" (بے گار) کرتے گزر جاتی۔ زمیندار کا طبقہ انتہائی طاقتور تھا۔ ان سے ٹکر لینے کا تصور بھی محال تھا۔ روپوش نوجوانوں نے روی نارائین ریڈی کی سرکردگی میں ظلم، جبر اور استحصال کے اس نظام کو توڑنے کا عزم کیا۔ ان سب کی کوششوں سے تلنگانہ جاگ اٹھا۔ مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا۔ اگست ۱۹۴۷ء میں انگریز حکمرانوں کے چلے جانے کے بعد مرکزی حکومت کے اشارے پر مدراس حکومت ان کی سرگرمیوں سے چشم پوشی کرتی رہی۔ بھارتی حکومت چاہتی تھی کہ کمیونسٹ جدوجہد سے نظام کی حکومت کمزور ہوجائے اور رضاکار تنظیم کا خاتمہ ہو تو وہ دندناتے ہوئے حیدرآباد میں داخل ہوسکیں۔ کمیونسٹ قیادت نادانستہ طور پر اس سازش کا حصہ بن گئی۔ اس زمانہ میں مخدوم کا قیام زیادہ تر وجے واڑہ میں رہا۔ وہ بعد میں مسلح جدوجہد کی مخالفت کرنے لگے تھے جس پر پارٹی کے معتوب رہے۔ ان کا برائے نام گزارہ الاؤنس بند کردیا گیا۔ وہ اکثر شہر حیدرآباد آتے رہے، بعض موقعوں پر ان کی گرفتاری یقینی ہوگئی تھی لیکن بچ نکلے۔ روپوشی کے زمانہ (۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۱ء) میں حیدرآباد کے ہر نوجوان کی زبان پر ان کے لئے دعا تھی۔

صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

روپوشی کے زمانہ میں بھی مخدوم بے خوفی سے حیدرآباد کے چکر لگاتے رہتے۔ کبھی اختر حسن کے گھر میں پناہ لیتے، کبھی احسن علی مرزا کے گھر میں، کبھی ہندوؤں جیسا نام رکھ کر کسی ہندو دوست کے گھر میں رہ جاتے۔ سارا دن پارٹی کے کاموں میں

فرد معلوم ہونے لگتے احسن علی مرزا لکھتے ہیں :

"دس پندرہ دن کی اس مختصر مدت میں صرف ایک دفعہ میری ملاقات مخدوم سے ہو سکی۔ مخدوم میری ماں کے لئے بیٹا بن چکا تھا۔ ان کے (مخدوم کے) کمرے کی کنجی ان کے آنچل سے بندھی رہتی۔ وہ ان کے کپڑے دھوتیں، ان کا بستر صاف کرتیں، کتابوں کو سلیقے سے جماتیں۔"

(احسن علی مرزا : "مخدوم محی الدین" مشمولہ آدم مخدوم نمبر جنوری ۱۹۷۰ء : ص ۱۵۸)

احسن علی مرزا صحافی تھے۔ وہ رات بھر اخبار کے دفتر ہی میں رہتے، یہی وقت مخدوم کے گھر میں رہنے کا تھا۔ مرزا کی والدہ مخدوم کا ہر طرح سے خیال رکھتیں۔ ہر ضرورت کو پورا کریں اور انتہائی احتیاط سے کام لیتیں کہ ان کو موجودتی کا راز افشا نہ ہوجائے۔ مخدوم بھی ان کی خاطرداری کرتے۔ ایک بار جب ان کی طبیعت ناساز تھی تو مخدوم سویرے اٹھ کر ان کے وضو کے لئے پانی گرم کرتے۔ محبت اور اشتیاق انھیں خدمت پر مائل کرتا لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ چولہا نہ جلا پاتے۔ لکڑیوں کو پھونکتے پھونکتے دھوئیں سے ان کی آنکھیں سرخ ہوجاتیں لیکن وہ خدمت کے جذبہ سے سرشار اس کی پروا نہ کرتے۔

وہ ریاست یا ریاست کے باہر جس کام پر مقرر کئے جاتے اطمینان سے سفر کرتے۔ پارٹی کے صدر دفتر بمبئی ان کا اکثر جانا ہوتا۔ انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں بھی شرکت کی تھی۔ روپوشی کے اس دور میں وہ صرف ایک نظم "تلنگانہ" کہہ سکے۔ سیاسی مصروفیات نے انھیں شاعری سے بیگانہ کردیا تھا۔

مئی ۱۹۵۱ء میں مخدوم اڈ۔ یکمیٹ میں اپنے ایک دوست کی یہاں قیام پذیر تھے کہ پولیس نے چھاپہ مارا اور انھیں گرفتار کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک پولیس افسر اپنی "کارگزاریوں" کی وجہ سے معطل تھا۔ اسے کسی طرح مخدوم کی موجودگی کا علم ہوگیا۔ اپنی نوکری بحال کروانے کے لئے اس نے مخدوم کو گرفتار کیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے پولیس افسر کی بیوی کو مخدوم کی گرفتاری کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بیمار ہوگئیں اور چند

دنوں میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر چنچل گوڑہ جیل میں مقید کردیئے گئے جہاں انھوں نے اپنی مشہور نظم "قید" لکھی۔

اس وقت تک پارٹی میں ایک مضبوط رائے قائم ہوچکی تھی کہ مسلح جدوجہد ختم کرکے آئینی راستے اختیار کئے جائیں۔ یہاں تک کہ جیوتی باسو، مظفر احمد اور اے کے گوپالن بھی اس کے حامی ہوگئے تھے۔ حکومت سے گفت و شنید کے بعد مسلح جدوجہد ختم کردی گئی لیکن گیارہ لاکھ ایکڑ زمین جو بے زمین کسانوں کو دی گئی تھی اس پر ان کا قبضہ جائز قرار دیا گیا۔ گرفتار لیڈر آزاد ہوئے۔ جن کے خلاف وارنٹ تھے، منسوخ کردیئے گئے۔ مخدوم جنوری ۱۹۵۲ء میں اس وقت رہا ہوئے جب عام انتخابات کی سرگرمیاں شروع ہوچکی تھیں۔

رہائی کے بعد ان کے خیر مقدم کے لئے ایک جلسہ عام دیوان ڈیوڑھی میں منعقد کرنے کا اہتمام ہوا۔ مخدوم کو مشیر آباد سے دیوان ڈیوڑھی تک بہت بڑے جلوس کے ساتھ لایا گیا۔ اس سے قبل اتنا بڑا اجلاس کبھی نہ نکلا تھا۔ دیوان دیوڑھی کا میدان اپنی تنگی کا اعلان کر رہا تھا۔ نہ صرف میدان لوگوں سے بھرا ہوا تھا بلکہ اطراف کی سڑکوں پر انسانی سروں کا سیلاب نظر آرہا تھا۔ ایک طرف پتھرگٹی کی سڑک اور دوسری طرف پتہ بازار کی سڑک پر ہجوم ہی ہجوم تھا۔ مخدوم زندہ باد، لال باوٹا زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ یہ اس زمانہ کی رسم تھی کہ مزدوروں، محنت کشوں کے ہر جلسہ میں ان کی نظم "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" ضرور پڑھی جاتی تھی۔ کوئی ایک اس نظم کا آغاز کرتا۔ رفتہ رفتہ پورا مجمع کورس میں اسے گاتا۔ دیوان دیوڑھی میں بھی یہ منظر دہرایا گیا۔ مخدوم نے جیل ہی میں کہی نظم "قید" سنائی۔ اس روز حیدر آباد نے محبت کے جو نذرانے پیش کئے وہ کسی خوش نصیب کو کبھی میسر نہ آئے ہوں گے۔

مخدوم نے بھی عام انتخابات میں حصہ لیا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے نہیں بلکہ عوامی محاذ کے نامزد امیدوار تھے۔ محاذ کا انتخابی نشان پنجہ تھا۔ جن حلقوں سے محاذ کے امیدوار کھڑے تھے وہاں کوئی ایسی دیوار نہ تھی جس پر پنجہ بنا ہوا نہ ہو۔ ان کے مقابلہ میں دیگر امیدواروں کے علاوہ ان کے استاد پروفیسر حسین علی خان کی اہلیہ معصومہ بیگم کانگریس کی نامزد امیدوار تھیں۔ شہروں نے ان دونوں کے درمیان ہونے والے

تقریری معرکوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ ہر بار جیت مخدوم کی ہوتی تھی۔ جب لوگوں نے اس فرق کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا :

"میں پروفیسر حسین علی خان کا شاگرد ہوں۔ حق شاگردی ادا کررہا ہوں۔ وہ تو ان کی صرف بیگم ہیں۔"

جن آنکھوں نے مخدوم کے خیر مقدمی جلوس اور جلسہ کو دیکھا تھا ایک دن ان کے کانوں نے یہ بھی سنا کہ مخدوم الیکشن ہار گئے۔ اس کا یقین ان کے بدترین مخالف کو بھی نہ آیا۔ دراصل جیت کانگریس کی دھاندلی کی ہوئی تھی۔ بعد میں ضمنی انتخابات میں وہ حضور نگر سے کامیاب ہوئے۔

۱۹۵۳ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس نے انھیں ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونینز کے صدر دفتر واقع ویانا میں کام کرنے کے لئے نامزد کیا۔ انھوں نے یہ ذمہ داری بھی خوش اسلوبی سے نبھائی۔ فیڈریشن کے کام کے سلسلہ میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۵ء تک کے زمانہ میں چیکو سلواکیہ، آسٹریا، چین، سری لنکا، نائیجیریا اور افریقہ کے دیگر ممالک کے دورے کئے۔ اپنے دوروں کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ :

"امن عالم اور دنیا کے مزدوروں کی عالمگیر تحریک کے سلسلہ میں مجھے ۹ مارچ ۱۹۵۳ء سے ۲۶ جولائی ۱۹۵۵ء تک یورپ، ایشیاء اور افریقہ کے کئی ملکوں (کہیں ایک بار کہیں ایک سے زائد بار) جانے، رہنے سہنے، لوگوں سے ملنے جلنے اور دوست بنانے کا موقع ملا۔ مجھے آرزو رہ گئی کہ سمندری سفر کروں۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ میل کا سفر ہوائی ہی رہا۔"

(مخدوم : مضمون "تمغہ" : اخبار ریاست حیدرآباد دکن : دسمبر ۱۹۵۷ء)

اس دوران انھوں نے متعدد کانفرنسوں میں شرکت کی۔ مختلف نمائندوں سے تبادلہ خیال کیا۔ ہر ملک میں مزدوروں کو درپیش مسائل سے آگاہی حاصل کی اور اپنے ملک کے مسائل بیان کئے۔ ان کی گوناگوں مصروفیات نے اجازت نہیں دی کہ وہ اپنا سفرنامہ لکھتے۔ وہ لکھنا چاہتے تھے اور اس کے چیدہ چیدہ حصے "یورپ کا لکھنؤ۔ ویانا" "اپنا کھانا اپنا گانا" "راحت جان" "عید اور خودکشی" "تمغے (۱)" اور "تمغے (۲)" کے

عنوانات سے اخبار سیاست اور رسالہ صبا میں شائع کروائے لیکن سفرنامہ مکمل نہ ہوسکا۔ متذکرہ مضامین تجربات کی تنوع اور تحریر کی بے ساختگی کی بنا پر انسانوی ادب سے زیادہ دلچسپ ہیں۔

وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہمیشہ رکن رہے۔ اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پارٹی کی تنظیم کو مستحکم کیا۔ آندھرا پردیش لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت پر فائز رہے اور کونسل میں کمیونسٹ گروہ کے لیڈر رہے ہاؤسنگ بورڈ سے بھی متعلق رہے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ پارٹی کی سٹی کونسل کی رکنیت پر فائز رہے اور کونسل کے صدر بھی منتخب کئے گئے۔ انھوں نے ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کی' لیکن پارٹی اراکین میں ایسے اختلافات پیدا ہوگئے تھے کہ ان کو دور کرنے کے لئے مخدوم کے سوا کوئی مناسب لیڈر موجود نہ تھا۔ اس کام کے سلسلہ میں انھوں نے انوکھا طریقہ اختیار کیا۔ سٹی کونسل کی مجلس عاملہ کا اجلاس شہر میں بلانے کے بجائے پکنک کے مقام گنڈی پیٹھ میں طلب کیا۔ وہاں کے خوب صورت ٹورسٹ بنگلے اور پر فضا ماحول میں میٹنگ پکنک کے انداز میں ہوئی اور سارے متنازعہ مسائل خوش مزاجی اور خوش دلی سے طے ہوگئے۔ لوگ کہتے تھے کہ "گنڈی پیٹھ کا جادو چل گیا" حالانکہ صحیح بات یہ تھی کہ "مخدوم کا جادو چل گیا"۔ وہ گھمبیر مسائل کا سامنا ٹھنڈے دل و دماغ سے کرنے کے عادی تھے۔

بہار جشن مخدوم : مخدوم فروری ۱۹۶۸ء میں ساٹھ سال کے ہوجاتے لیکن ان کے چاہنے والوں کو جشن منانے کی جلدی تھی اس لئے ۱۰ دسمبر ۱۹۶۶ء ہی میں ان کی ساٹھویں سالگرہ منائی گئی۔ "جشن مخدوم" سے ایک دن قبل ۸ دسمبر دیوڑھی صارم جنگ میں ایک محفل "پیلا دوشالہ" منعقد کی گئی۔ اس کے داعی مرزا مظہر الحسن تھے۔ دوست احباب اور عقیدت مندوں کے ہجوم میں مخدوم کو پیلا دو شالہ پیش کیا گیا۔ فائن آرٹس اکیڈمی کے آرٹسٹوں نے جامعہ کے زمانہ کی ان کی نظم "پیلا دوشالہ" کو قوالی کی انداز میں پیش کیا۔

"جشن مخدوم" کی تقریب ۱۰ دسمبر کی شام کو سروجینی دیوی' ہال رام کوٹ میں منعقد ہوئی۔ افتتاحی تقریب کی صدارت سجاد ظہیر نے کی۔ مخدوم کمیٹی کی مجلس استقبالیہ کے صدر عابد علی خاں کی خیر مقدمی تقریر سے اجلاس کا آغاز ہوا۔ آندھرا

پردیش کے چیف منسٹر جو سیاسی اعتبار سے مخدوم کے حریف تھے شاندار الفاظ میں انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا:

"ایسے مخلص اور ایمان دار عوامی خدمت گزاروں کی جمہوریت کے ارتقاء کے لئے شدید ضرورت ہے۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی مکتب خیال سے ہو۔"

نواب مہدی نواز جنگ نے مخدوم کی گلپوشی کی۔ ان کے علاوہ ہندی پرچار سبھا' مرہٹی ساہتیہ پریشد' کرناٹک ساہتیہ پریشد اور انجمن ترقی اردو کی جانب سے بھی گلپوشی کی گئی۔ یدھ ویر ایڈیٹر اردو ملاپ اور مرزا شکور بیگ نے ان کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی۔ اس رات سروجنی دیوی ہال میں کلچرل پروگرام راجہ دھن راج گیر کی صدارت میں ہوا۔ فن کاروں نے مخدوم کا کلام ساز کے ساتھ پیش کیا۔ دوسرے دن صبح ساڑھے دس بجے ادبی اجلاس ہوا۔ مجلس صدارت میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں' بھارت چند کھنہ' کماری اندرا دھن راج گیر اور ڈاکٹر پونم چند شامل تھے۔ سری نواس لاہوتی' شہریار کاؤس جی' مرزا شکور بیگ' پروفیسر عالم خوند میری' اختر حسن' زینت ساجدہ' علی سردار جعفری' ڈاکٹر مسعود حسین خان اور دیگر ادیبوں' شاعروں' دانشوروں نے اپنے اپنے انداز میں خراج تحسین پیش کیا۔ جشن کی آخری تقریب کل ہند مشاعرہ تھی جس کا آغاز مخدوم نے اپنی نظم "رقص" سے کیا۔ ان کے علاوہ سردار جعفری' ساحر لدھیانوی' سلیمان اریب' حیرت بدایونی' سعید شہیدی' کنول پرشاد کنول' شاذ تمکنت' آذر زوبی' طالب رزاقی' ابن احمد تاب' خیرات ندیم' بانو طاہرہ سعید' راشد آذر' سلیمان خطیب اور دلاور فگار وغیرہ نے کلام سنایا۔ مخدوم کی مقبول نظم "انتظار" کا تلگو ترجمہ بھی پیش کیا گیا۔ اس تقریب کے دوران ان کا اس وقت تک کا کلیات "بساط رقص" شائع ہوا۔ تقریب کیا تھی محبتوں کی بارش تھی۔ ادبی اجلاس کے مضامین کو رسالہ صبا نے "مخدوم نمبر" میں محفوظ کرلیا ہے۔

۱۹۶۸ء میں حیدرآباد میں چاول اتنے گراں ہوگئے تھے کہ غریب تو کیا متوسط طبقہ بھی اسے برداشت نہ کرسکتا تھا۔ مخدوم نے اس ہوشربا گرانی کے خلاف آواز بلند کی۔ جب اس کا اثر نہ ہوا تو اس ساٹھ سال کے بوڑھے نے اپنی زندگی داؤ پر لگادی اور

بھوک ہڑتال کردی۔ اس کے نتیجہ کے طور پر چاول سستا تو نہیں ہوا لیکن گرانی میں مزید اضافہ بھی نہیں ہوا۔

اسی سال کے اواخر میں غالب صدی منانے کی تحریک ہوئی۔ اس کے لئے ایک ریاستی کمیٹی تشکیل پائی۔ دلدار حسین انجینئر صدر بنائے گئے۔ مخدوم کے علاوہ بیرسٹر اکبر علی خاں' ڈاکٹر حسینی شاہد' ڈاکٹر زینت ساجدہ' ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور عابد علی خاں اس کے اراکین مقرر ہوئے۔ جہاں عابد علی خاں ہوں وہاں انتظامی امور میں کسی دوسرے کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھیں مخدوم کی رہنمائی حاصل رہی۔ غالب صدی تقریبات کے سلسلہ میں جو مشاعرہ ہوا اس میں شرکت کے لئے مخدوم' فیض کو لے آئے جو کسی مشاعرہ کے سلسلہ میں بمبئی پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے پاس حیدرآباد کا ویزا نہ تھا۔ مخدوم نے چند گھنٹوں میں اس کا بھی انتظام کردیا۔

سو گیا ساز پہ سر رکھ کر سحر سے پہلے : مخدوم نے اپنی زندگی عوامی مسائل حل کرنے کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ انھیں ہمیشہ دوسروں کا خیال رہا اور کبھی اپنا خیال کیا ہی نہیں۔ عمر کی ساٹھ منزلیں طے کرنے کے باوجود نوجوانوں کی طرح چاق و چوبند رہے۔ ان کی مصروفیات شب و روز جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دل نے ان کی امنگوں اور محنتوں کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔ ۱۹۶۹ء کے ابتدائی دنوں میں ان کے سینے میں درد رہنے لگا۔ انھوں نے آٹو رکشا میں سفر کرنا ترک کردیا لیکن اپنے درد کا حال عزیزوں یا دوستوں میں کسی کو نہ بتلایا۔ اگست ۱۹۶۹ء میں وہ پارٹی کے کام کے سلسلہ ہی میں دہلی گئے۔ ۲۴ اگست کی شام ان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ راجے شور راؤ' راج بہادر اور مہندر نے انھیں ٹیکسی کے ذریعے اروِن ہسپتال پہنچایا۔ سارا راستہ وہ پسینے میں شرابور انتہائی کرب کی حالت میں رہے۔ انھیں ایمرجنسی وارڈ کے بستر نمبر ۴۸ پر لٹا کر آکسیجن دی گئی۔ درد کا احساس زائل کرنے کے لئے خواب آور دوا دی گئی۔ الکٹرو کارڈیو گرام سے معلوم ہوا کہ ان کے قلب پر مرض کا شدید حملہ ہوا ہے۔ بات تشویش ناک تھی لیکن ڈاکٹروں نے راج بہادر کے سوا کسی کو نہ بتلائی۔ مخدوم نے رات نیم خوابیدگی میں گزار دی۔ صبح پانچ بجے بیدار ہوئے۔ چائے اور اخبار کی طلب ہوئی۔ بظاہر حالت پر سکون معلوم ہوتی

تھی کہ دوپہر میں اچانک بگڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے تفصیلی معائنہ کے بعد ناامیدی ظاہر کردی۔ فوراً بیگم مخدوم کو تار کے ذریعے دہلی آنے کے لئے کہا گیا۔ وہ شام ہی کو اپنے بیٹے نصرت محی الدین کے ساتھ پہنچ گئیں۔ مخدوم پر غنودگی طاری تھی۔ بیگم مخدوم نے پیشانی پر ہاتھ رکھا تو آنکھیں کھول کر انھیں دیکھا پھر بند کرلیں۔ انھیں ایک طرف آکسیجن دی جارہی تھی۔ دوسری طرف گلوکوز چڑھایا جارہا تھا۔ وہ حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ رات آٹھ بج کر بیس منٹ پر موت غالب آگئی۔ کسی سے نہ ہارنے والا موت سے ہار گیا۔

ان کی میت رات بھر ہسپتال میں رہی۔ اسے ۲۶ اگست کی صبح ونڈسر پیلس میں واقع کمیونسٹ پارٹی کی پارلیمنٹری دفتر میں پہنچایا گیا۔ دہلی میں ان کے انتقال کی خبر عام ہوچکی تھی۔ وہاں پہلے ہی لوگ جمع ہوچکے تھے جن میں عام لوگوں، پارٹی کے کارکنوں کے علاوہ اراکین پارلیمنٹ، سیاست داں، شاعر، ادیب، دانشور، اساتذہ، طلبہ، ٹریڈ یونین لیڈر شامل تھے۔ دن کے گیارہ بجے تک ان کا آخری دیدار ہوتا رہا پھر ان کی میت کو تابوت میں بند کرکے ائیرپورٹ پہنچایا گیا۔ بارہ بج کر پچاس منٹ پر طیارہ حیدرآباد کے لئے روانہ ہوا۔ بیگم مخدوم، نصرت، راج بہادر اور دوسرے لوگ ساتھ تھے۔

حیدرآباد میں رات ہی کو ان کے انتقال کی خبر پہنچ چکی تھی۔ وہاں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ ان کے چاہنے والوں نے آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ رات گزاری۔ صبح ہوتے ہوتے بیگم پیٹھ کے ہوائی اڈے اور پارٹی کے دفتر میں مجمع ہونے لگا۔ جہاز پہنچا، بیگم مخدوم اور نصرت اس میں سے برآمد ہوئے۔ انھیں دیکھ کر لوگوں کے صبر و ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ ائیرپورٹ ماتم کدہ بن گیا۔ آنسوؤں کے نذرانے کے ساتھ تابوت کو ایک ٹرک پر رکھا گیا۔ اس پر سرخ پرچم ڈال دیا گیا۔ متعدد اداروں اور انجمنوں کی طرف سے اتنے پھول چڑھائے گئے کہ تابوت پھولوں کا ڈھیر بن گیا۔ ٹرک ان کی قیام گاہ ایم۔ایل۔اے کوارٹرز کی طرف روانہ ہوا۔ راستوں پر سوگواروں کا ہجوم تھا۔ ان کی قیام گاہ کے پاس ایک وسیع و عریض شامیانہ لگا دیا گیا تھا۔ جب میت وہاں پہنچی تو وہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سب آخری دیدار کے لئے تڑپ رہے تھے۔ یہاں تک کہ

جب غسل میت کا وقت آیا تو لوگوں کو وہاں سے منت سماجت کر کے بڑی مشکل سے نکالا گیا۔ غسل میت کا فرض اس شامیانے میں ادا ہوا۔ اس کے بعد شام تک دیدار عام ہوتا رہا۔ ساڑھے پانچ بجے جنازہ نمائش میدان کے لئے روانہ ہوا۔ آگے آگے دو موٹر سائیکل سوار تھے۔ ان کے پیچھے دو ٹرک اور بے شمار موٹر کاریں تھیں۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں پیدل چل رہے تھے۔ حمایت نگر، کنگ کوٹھی، عابد روڈ، معظم جاہی مارکیٹ سے ہوتا ہوا میت کا جلوس نمائش میدان دو گھنٹے میں پہنچا۔ سڑکوں پر لوگ دو رویہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ رات آٹھ بج کر دس منٹ پر جنازہ مسجد مالا کنٹہ پہنچایا گیا جہاں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ساڑھے آٹھ بجے مخدوم اپنی آخری آرام گاہ واقع درگاہ شاہ خاموش کی طرف رانہ ہوئے جہاں رات کی تاریکی میں انھیں سپرد خاک کردیا گیا۔ لوگ زبان حال سے کہہ رہے تھے :

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے
شاخ گل کھوئی ہوئی، مرغ خوش الحاں چپ ہے

یادگار تعزیتی جلسے

مخدوم کی وفات پر ملک بھر میں تعزیتی جلسے خصوصاً حیدر آباد شہر میں یہ سلسلہ ہفتوں جاری رہا ان کے چاہنے والے اپنے اپنے انداز میں آنسوؤں کا خراج ادا کرتے رہے۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۹ء کی شام کو آندھیرا سرسوت پر یشد کے ہال میں "یاد مخدوم" کا اہتمام کیا گیا جلسے کی صدارت ڈاکٹر عالم خوزر میری نے کی۔ دیگر مقررین کے علاوہ رسالہ صبا کے ایڈیٹر سلیمان اریب نے بھی اپنا مضمون "آخر شب کا مسافر" پڑھا۔ اپنی مخدوم سے قربت کے اظہار کی خاطر وہ محفل شبینہ کی ایسی باتیں کہہ گئے جو سامعین کے حسن عقیدت کو پاش پاش کرتی تھیں۔ اس سلسلہ میں اریب نے کہا تھا۔

"رات کے دو بجے ہیں۔ مخدوم کہتے ہیں ہاں یار اب نشہ ٹوٹ رہا ہے مگر شراب اور ملے گی کہاں؟ یہ شراب اور عورت ہر جگہ اور ہر وقت کیوں نہیں ملتی"

سامعین میں کوئی باور کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ مخدوم خلوت میں بھی اس قدر

پستی میں گر کرنا قابل یقین جملے ادا کر سکتے ہیں۔ ان کے چاہنے والوں نے ہوٹنگ شروع کر دی ادیب نے اپنے بیان کی صحت پر اصرار کیا تو ٹماٹروں اور گندے انڈوں سے تواضع ہوئی۔

اس جلسے میں مخصوص طرز فکر وطرز اظہار رکھنے والوں نے اپنی روایت کو دھرایا اور چاہنے والوں اپنے انداز میں مخدوم کا دفاع کیا' ترقی پسندوں کا ہمیشہ رویہ رہا ہے کہ اچھائی بیان کریں یا نہ کریں چھوٹی سی برائی کو ہمالیہ کے برابر چڑھا کر ضرور پیش کریں ان کے نظریے کے تحت حقیقت نگاری کی تکمیل کسی کی شان میں گستاخی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔

مخدوم کا ماتم اور ان سے اظہار عقیدت :۔

مخدوم کے انتقال پر بے شمار تعزیتی مضامین لکھے گئے شعراء نے اپنے غم انگیز جذبات کا اظہار نظموں میں کیا۔ ذیل میں سلیمان خطیب کا لکھا ہو مرثیہ "لوک دوانہ" درج ہے۔

جاکر کو میدک گھر گھر بانٹا بانکی ترچھی ٹوپی والا
من کا موتی نھنا ساتھی مخدوم روانہ کاں ہے جی
دل میں چھالے آنکھ میں آنسو پاؤں میں کانٹے ہاتھ میں پھولاں
مسجد مندر آگے پیچھے ایسا دوانہ کاں ہے جی
چمپا چنبیلی دونا مروہ گیندہ سہرہ جوہی بیلا
جاکو جس کے گیت ہیں مہکے سائیں سیانہ کاں ہے جی
بھاگ نگر کے بانکے لوگاں لے کو بھاگے ہنسی والا
بھیگے پلکاں دے کے ساجن نرم کلیجہ تھتی چھنتی
بھکے بیٹھے مال اٹھایا لوک دوانہ کاں ہے جی

دوسرا باب

رنگ تصویر کہاں، نقش ہے حیراں حیراں

مخدوم! دکن کی سیاہ چٹانوں سے تراشہ ہوا مجسمہ، آبنوسی چہرے کا ہر نقش حسن و جاذبیت کا نمونہ، بلند پیشانی، ستواں ناک، بولتی آنکھیں، مسکراتے ہونٹ، اوسط سے نکلتا قد، کھرا بدن، جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔ ایک صفت ہوتی ہے "موہنی" جو لاکھوں میں کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ اسی میں وہ مقناطیسیت ہوتی ہے جو دلوں کو کھینچتی ہے۔ مخدوم کے پیکر میں "موہنی" کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ زمانے نے ان کے دیوتائی نقوش اور شخصیت کی موہنی کو مسمار کرنے کے لئے کونسا حربہ استعمال نہیں کیا۔ مخدوم نے ہر وار کو خالی دیا۔ اپنی جگہ مضبوط چٹان کی طرح قائم رہے۔ بڑھتے ہوئے ہر ریلہ کا منہ موڑ دیا۔ کشمکش حیات کے بغیر کوئی لمحہ نہ گزرا لیکن ان کی شخصیت اور ذات میں دراڑ پڑنا تو بڑی بات ہے خراش تک نہ آئی۔

پیدائش کے اعتبار سے ان کا تعلق دیہات کے نچلے درمیانی طبقے سے تھا۔ وہ ہمیشہ اسی سے وابستہ رہے۔ اس طبقے کی سادگی، انسان دوستی، محبت، صبر و قناعت کو اپنایا لیکن اس کی بے عملی اور منافقت کو نہیں اپنایا۔ ان کی زندگی جہد مسلسل کی داستان ہے۔ ان کا مقصد حصول دولت و ثروت نہ تھا۔ ہوس زر ان کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ اگر چاہتے تو اقتدار اور دولت کو لونڈی بنا کر رکھ سکتے تھے۔ جس ملک میں سیاست کا مقصد ہی دولت و ثروت ہو وہاں ان کا ہر داغ سے دامن بچائے رکھنا ان کے کردار کا نمایاں پہلو ہے۔ روی نارائن ریڈی اور مخدوم کا برسہابرس ساتھ رہا۔ وہ ہر نشیب و فراز سے ایک ساتھ گذرے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے مخدوم کو کبھی مایوس اور دل شکستہ نہیں دیکھا۔ انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ مخدوم نے بارہ لاکھ ایکڑ زمین کسانوں میں تقسیم کی۔ ہاؤسنگ بورڈ کے رکن رہتے ہوئے بے غرضی کا

ثبوت یوں دیا کہ کرایہ کے مکانوں میں زندگی گزاری اور پس ماندہ گان کے لئے ورثہ میں ایک جھونپڑی بھی نہیں چھوڑی۔ نو آزاد ملکوں کی جمہوریتوں کا یہ خاصا ہے کہ حکمراں خود بھی لوٹتے ہیں اور اپنوں کو ہی نہیں نوازتے بلکہ نواز شات کے حربوں سے مخالفوں کو بھی زیر کرتے ہیں۔ مخدوم ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۹ء تک اپوزیشن لیڈر رہے۔ ان کی ناز برادری کے لئے حیدر آباد سے دہلی تک کون کون بے چین نہ رہا۔ لوٹ کے اس بازار سے وہ گزرتے رہے لیکن خریدار نہیں بنے اور نہ بکنے کے لئے تیار ہوئے۔ یقیناً ذات کی حد تک بے غرضی اور بے نیازی بڑی بات ہے۔ اس میں سخت مقام بھی آتے ہیں خصوصاً جب اولاد پیش نظر ہو۔ انھوں نے اصولوں کی خاطر اولاد کے مفاد اور ان کے مستقبل کی بھی پروا نہ کی۔ ان کے لئے کوٹھی نہ سہی رہائش کا معمولی بندوبست نہ کیا کیونکہ یہ ہمیشہ ان کی مالی حیثیت سے بالاتر مسئلہ رہا۔ اس خصوص میں مخدوم یقیناً تعریف کے مستحق ہیں اور ان سے زیادہ تعریف کی مستحق ان کی اہلیہ ہیں جنھوں نے عام سی مشرقی عورت کی طرح ضد اور ناز آفرینی سے شوہر کو ان کے اصولوں سے ہٹنے کے لئے کبھی نہیں کہا۔

برصغیر کی معروف خواتین میں چند ایسی بھی ہیں جنھوں نے براہ راست ملک یا قوم کی خدمت نہیں کی۔ شوہروں کے ساتھ ان کا خاموش تعاون کرنا، مصائب کا خوش دلی سے سامنا کرنا، خانہ داری کے تمام فرائض کو خود ادا کرکے شوہر کو حصول مقاصد کے لئے آزاد چھوڑ دینا، ہر حال میں اطمینان اور آسودگی کا اظہار کرنا، بدترین حالات میں وفا کا اعلیٰ ترین معیار قائم کرنا ان خواتین کا شیوہ رہا ہے۔ اسی لئے جب بیگم حسرت موہانی بیگم مولانا آزاد اور بیگم مخدوم کا ذکر ہوتا ہے تو واقف کاروں کے سر تعظیم میں جھک جاتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ان قائدین کے کاندھوں پر ان کی بیگمات کا نظر نہ آنے والا ہاتھ نہ ہوتا تو شائد کسی منزل پر انھیں تھکن کا احساس ہو جاتا۔ جہد حیات میں وفا اور تعاون کی شمعوں نے ان شخصیات کو پر نور چہرے بخشے۔ مخدوم اس معاملہ میں مولانا آزاد اور مولانا حسرت سے زیادہ خوش نصیب تھے کہ آخری سانس تک انھیں بیگم مخدوم کا ساتھ میسر رہا۔

مخدوم کی طالب علمی اور روپوشی کے زمانہ میں ان کی اہلیہ اور بچے سمیع الدین

صاحب کی زیر سرپرستی رہے۔ روپوشی کے زمانہ میں پارٹی کی جانب سے جو برائے نام گزارہ الاؤنس دیا جاتا اسی پر قناعت کی۔ باپ سے بچوں کی دوری ان میں نفسیاتی الجھنیں پیدا کر سکتی تھیں لیکن بیگم مخدوم، بچوں کے نانا سمیع الدین صاحب نے اور ماموں نظام الدین نے انھیں اتنا پیار دیا کہ وہ کسی الجھن کے شکار ہوئے اور نہ ان کی تعلیم متاثر ہوئی۔ وہ بچوں کے لیے "بابا" نہیں "چچا بابا" تھے۔ وہ اپنے بچوں پر جان نچھاور کرتے تھے اس کے باوجود ریاستی قانون ساز کونسل کے رکن اور اپوزیشن لیڈر تھے انھوں نے اپنے بیٹے کو سفارش کے ذریعہ نوکری دلانے کی سعی نہیں کی۔ ان کے فرزند نصرت محی الدین کا کہنا ہے کہ :

> "انھیں کے کہنے پر میں نے I.T.I.M کا نسٹ پاس کرلیا پھر نوکری کی تلاش شروع ہوئی مگر افسوس ہنوز سروس نہیں ملی۔ چچا بابا چاہتے تو میں کسی اچھی سروس سے منسلک ہو سکتا تھا مگر وہ بطور خاص میرے لئے سفارش کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے نوکری کیسے نہیں ملتی! میں تو کامریڈ مخدوم کا بیٹا ہوں اور اکثر تو یہ کہتے ہیں کہ مجھے نوکری کی ضرورت کیوں لاحق ہے جب کہ میرے والد بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ بھلا میں ان لوگوں کو کیا جواب دوں۔" (رسالہ صبا مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء : ص ۲۶۹)

یہ بات بھی نہیں کہ مخدوم گھر کے معاملات سے بالکل بے تعلق رہتے ہوں۔ اس کی بھی شہادت نصرت محی الدین نے دی ہے وہ کہتے ہیں :

"وہ ایک عام گھریلو اور ذمہ دار شخص سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ کبھی کبھار گھر کا سودا سلف خود لیا کرتے ہیں اور یوں وہ بازار کے داموں سے لے کر دھوبی کے حساب کتاب تک سے واقف رہتے ہیں۔" (ایضاً)

مخدوم کو کم سنی میں رہن سہن کا جو طریقہ سکھایا گیا اس پر وہ زندگی بھر کار بند رہے۔ ہمیشہ سادا زندگی گزاری، ضروریات زندگی کو محدود رکھا تاکہ کبھی تنگ دستی کا غم نہ ہو۔ حیدرآباد کی سڑکوں پر عام آدمی کی طرح کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر، کبھی رکشا پر نظر آتے نہ ان میں لیڈرانہ شان تھی اور نہ شاعرانہ شوکت! مغل پورہ کی گلیوں کو

چھوڑ کر ایم۔ ایل۔ اے کوارٹر کو آباد کیا تب بھی ان کے "معیار زندگی" میں کوئی فرق نہ آیا۔ ظاہر پرستی، نمائش پسندی اور دکھاوا ان میں کبھی پیدا نہ ہوا اور نہ اپنی "حالت زار" پر انھیں کبھی پشیمانی ہوئی۔ کالج کے زمانہ میں جانے کس طرح یونیفارم کی گہری نیلی شیروانی سلوائی تھی۔ برسوں یہی ان کا "یونیفارم" تھا جامعہ چھوٹ گیا مگر وہ شیروانی نہ چھوٹی۔ یہاں تک کہ اس کا رنگ بھی اصلی حالت پر قائم نہ رہا۔ اس شیروانی کو کبھی دھوبی کے گھر یا گھاٹ جانا نصیب نہ ہوا۔ ایک تو اس لئے کہ دھلائی کون دیتا دوسرے شیروانی کی جدائی میں نعم البدل کیا ہوتا؟ سٹی کالج کی ملازمت ترک کرکے ریلوے یونین سے وابستہ ہوئے تو خالی نیکر اور شرٹ پہننے لگے تھے۔ اچھے دنوں میں بش شرٹ اور پینٹ بھی پہنا۔ وہ یادگار شیروانی کی طرح ایک یادگار سیاہ کوٹ کے مالک بھی تھے اپنے ٹریڈ یونین ازم کے زمانہ میں وہ کوشش بھی کرتے تو سیاہ کوٹ انھیں چھوڑنے کے لئے راضی نہ ہوتا۔ حیدر آباد لیجسلیٹو کونسل کا یہ ممبر جب دہلی جاتا تو محل نما حیدر آباد ہاؤس میں ٹھہرنا اس کا حق تھا۔ اس کا مزاج اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ راج بہادر گوڑ رکن راجیہ سبھا کے ساتھ رہتے جہاں انھیں حیدر آباد ہاؤس سے زیادہ سکون ملتا تھا۔

مخدوم نے زندگی جہد مسلسل میں گزاری، کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ یہ ایسی کامیابیاں نہ تھیں جن سے ان کی ذات کو فائدہ پہنچتا۔ انھوں نے ذاتی فائدے کے لئے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ سجاد ظہیر اسی کو مخدوم کی قبل از وقت موت کا سبب قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں :

> "اگر مخدوم کی اچانک اور قبل از وقت وفات ہوئی تو اس کا سبب یہی ہے کہ مخدوم نے اپنے جسم اور اپنی ذات کو ان کا وہ تھوڑا سا حق بھی دینے سے انکار کر دیا جو صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھا" (نیا آدم! مخدوم نمبر! ص ۱۳۲)

انھوں نے تین ماہ تک خاموشی کے ساتھ سینے کا درد اور حلق کی جلن برداشت کی۔ کسی سے اس کا ذکر کرنا بھی ضروری نہ سمجھا ان کے پاس اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ وہ اپنا علاج کرواسکتے جب کہ رکن لیجسلیٹو کونسل کی حیثیت سے انھیں مفت علاج

ی سہولت حاصل تھی۔ صرف اتنی احتیاط برتی کہ رکشا میں سفر کرنا چھوڑ دیا کہ اس
سے سینے کے درد میں اضافہ ہوتا تھا۔

مخدوم کمیونسٹ تھے لیکن اس گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے جو دہریت، شرک اور الحاد کو کمیونزم کا لازمہ سمجھتے ہیں۔ انھوں نے بچپن سخت مذہبی گھرانے میں گزارا۔ اس کے اثرات کبھی فنا نہیں ہوئے۔ یہ درست ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند نہیں تھے۔ مذہب سے رغبت کا کبھی اظہار بھی نہیں کیا لیکن اس سے تنفر بھی ظاہر نہ کیا۔ ان کے کلام میں ایک آدھ مصرع قابل اعتراض ضرور ملتا ہے۔ وہ بھی سخن طرازی کے لئے ہے۔ ایک صحت مند اور متوازن ذہن رکھنے کی وجہ سے معتدل رویہ اختیار کیا۔ کسی مذہب کو سختی سے ماننے یا سختی سے انکار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ موضوع کا وسیع مطالعہ کیا ہو اور اپنے حاصل کئے ہوئے علم کو "عقل سلیم" (اگر ہو) کی کسوٹی پر کسا ہو اور ایسی شہادتیں ثبوت اور استدلال جمع کئے ہوں کہ حمایت یا مخالفت میں مباحثہ مذاکرہ یا مناظرہ کرسکتے ہوں۔ تب ہی زبان کھولنا زیب دیتا ہے۔ جدید تہذیب و معاشرہ کے ایسے دور میں جب مذہب کی مبادیات کی شدبد بھی حاصل نہ ہو دانشوری کی شان یہ سمجھی جاتی ہے کہ مسلمات سے انکار کرکے یا لایعنی تاویلات سے کام لے کر مذہب سے انکار کیا جائے اور محفلوں میں واہ واہ لوٹی جائے۔ ایسے دانشوروں کے مبلغ علم کو دیکھتے ہوئے ان کے ارشادات عالیہ کو صرف اذہان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے مخدوم ایسے دانشوروں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنی سلامت روی کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ مذہب کے پابند نہ تھے تو اس سے بالکل بیگانہ بھی نہ تھے۔ ان کی بہو نصیرہ نصرت محی الدین نے اپنے مضمون (مشمولہ نیا آدم: مخدوم نمبر) میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک دن شعبان کی فاتحہ دینے کے لئے گھر میں کوئی مرد سوائے مخدوم کے موجود نہ تھا تو بہو نے ان سے فاتحہ دینے کو کہا۔ مخدوم نے نہایت خشوع و خضوع سے وضو کیا اور یہ فرض ادا کیا۔ ان کے اس عمل پر بہو کو تعجب ہوا تو انھوں نے کہا "ہم نے قرآن شریف طوطے کی طرح نہیں پڑھا ہم تو تفسیر بھی کرسکتے ہیں"

شاذ تمکنت لکھتے ہیں:

"مخدوم کی والدہ کے جلوس جنازہ میں جن احباب نے شرکت کی ہے وہ گواہی دیں گے کہ مذہبی رسومات کی تکمیل میں مخدوم نہایت ادب اور احترام سے شریک تھے تدفین کے بعد جب فاتحہ پڑھی جانے لگی تو مخدوم نے سر پر رومال باندھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس طرح اٹھالئے جیسے دعا کے وقت اٹھائے جاتے ہیں۔ فاتحہ کے بعد ختم قرآن پر دونوں ہاتھ منہ پر پھیر لئے جیسے کہ مسلمانوں کا دستور ہے۔"
(مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے : ص ۲۹)

شاذ تمکنت نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے کہ مشاعرہ کے سلسلہ میں ان کا اور مخدوم کا سرینگر جانا ہوا۔ قیام ساتھ ہی تھا۔ ایک دن دوپہر میں مخدوم کو سخت بھوک لگی۔ وہ کھانا کھانے کے لئے شاذ تمکنت کے ساتھ کمرے سے باہر نکلے۔ انھیں معلوم ہوا کہ ایک ساتھی نماز پڑھنے گیا ہے تو وہ کمرے میں لوٹ آئے اور بستر پر دراز ہوگئے۔ شاذ نے کھانے کے لئے چلنے پر اصرار کیا تو انھوں نے جواب دیا "عبادت گذاروں کا انتظار بھی عبادت ہے" (کتاب' مخدوم محی الدین' حیات و کارنامے : ص ۲۰)

مخدوم جانتے تھے جس معاملہ میں مخالفت یا موافقت کی علمیت اور اہلیت ان میں نہیں ہے اس کے لئے خاموشی ہی دانشمندی ہے انھوں نے سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے مذہب کو موضوع اظہار کبھی نہیں بنایا۔

کیمونزم سے مخدوم کی وابستگی صرف نظریاتی نہیں تھی۔ انھوں نے اس کو بطور نظریہ یونہی قبول نہیں کیا تھا۔ یہ ان کی زندگی کے پر مصائب تجربوں کا حاصل تھا۔ کم عمری میں باپ اور ماں کا سایہ جاتا رہا تھا۔ محبتوں کے ان سوتوں سے وہ محروم رہے۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی تنگ دستی اور نیم فاقہ کشی میں شب و روز گذارے یہ ان کی ذات کی مضبوطی تھی کہ اس حال میں کبھی ان کی ہمت نے جواب نہ دیا۔ یاسیت ان پر غالب نہیں آئی اور نہ انتقام کا جذبہ پیدا ہوا۔ ایسے حالات میں عام انسان کے یہی دو ردعمل ہوسکتے ہیں احساس شکست کی وجہ سے پسپائی' یاسیت اور قنوطیت' جس

زمانہ نے کچھ نہ دیا اس سے انتقام! مخدوم کے صحت مند شعور نے ان دونوں قسم کے
رد عمل کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ انھیں جتنی محرومیاں ملیں ان سے محروم طبقوں
کے لئے ہمدردی اور محبت کے چشمے پھوٹ نکلے۔ وہ اتنے پھیلے کہ ان کی زندگی دنیا بھر
کے محروم انسانوں کی خدمت اور ان کے درد دور کرنے کے لئے وقف ہوگئی۔ کمیونزم
ان کا مقصد نہیں ان کے انسان دوست مقاصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اس مہم جوئی
میں انھوں نے مظلوموں کا خیال رکھا اور اپنی ذات کو فراموش کردیا۔ ان میں نہ
دولت کی ہوس پیدا ہوئی نہ شہرت کی خواہش جاگی۔ انھوں نے ستائش کی تمنا کی اور
نہ صلہ کی پروا۔ کمیونزم سے وہ نظری اور عملی طور پر وابستہ رہے۔ وہ اس کے رموز
شناس بننے کی ہمہ وقت جستجو کرتے یہاں تک کہ تحریک کے مسلمہ رہنما تسلیم کرلئے
جانے کے بعد بھی ۱۹۶۸ء میں جب جدلیاتی مادیت کے موضوع پر ایک "مرکزی اسکول
کم سمینار" منعقد ہوا تو انھوں نے طالب علم کی حیثیت سے اس میں شرکت کی۔
محنت اور توجہ سے نوٹ لیتے رہے۔ سوالات کرتے رہے اور مباحثوں میں حصہ لیتے
رہے (بحوالہ نیا آدم' مخدوم نمبر: ص ۵۷) یہ ذوق اور شوق ان کے مزاج کا ترجمان
ہے جس کام کا بیڑا انھوں نے اٹھایا اسے خلوص اور مشقت سے انجام دیا۔ ان کا
انقلاب کا تصور شاعرانہ رومانویت نہیں صداقتوں پر مبنی پرخلوص عزم کا انجام ہے اس
راہ میں بھی بعض سخت مقام آئے۔ نظریے سے ان کی وفاداری رہی لیکن عملی اور
اطلاقی صورتوں کے بارے میں ان کی اپنی سوچ تھی۔ وہ اس طرح راہ عمل پر گامزن
نہیں رہے کہ انھیں ہدایت ملتی رہی بلکہ اس لئے کہ ان کے عقل و شعور نے یہ راہ
دکھلائی تھی اور جب پاسبان عقل دوسروں کے متعینہ لائحہ عمل کا ساتھ دینے تیار نہ
ہوا تو اپنی وفاداری کے باوجود انھوں نے اختلاف میں آواز بلند کی۔ تعاون اور اختلاف
دونوں حالتوں میں ان کا خلوص ہر شک و شبہ سے بالا تر رہا۔ اور ان کے لئے انھوں
نے عواقب کی پروا بھی نہ کی۔

مخدوم کے لاتعداد چاہنے والوں کے درمیان ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ان کے
نظریے کے حامی نہیں رہے۔ نظریے سے اختلاف کرنا ان کا حق تھا لیکن وہ اس
حقیقت سے انکار نہیں کرسکیں گے کہ مخدوم نے نظریہ کو ذاتی مفاد کا ذریعہ نہیں بنایا۔

انھوں نے کمیونزم کو بقائمی ہوش و حواس قبول کیا اور نیک نیتی سے اس پر عمل پیرا رہے۔ کمیونزم اور اشتراکی انقلاب ان کے لئے ایک نعرہ نہیں ایک مقصد تھا۔ انسان کی عظمت کو جانچنے کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ وہ جس نظریہ کا پرچار کرتا ہے کیا اس کے سانچے میں اپنی زندگی ڈھالنے کی ہمت بھی رکھتا ہے۔ اگر علم عمل کے ساتھ ہو تو اس کی صداقت کی شان ہی اور ہوتی ہے۔ مخدوم نے اپنے علم اور ایقان کو عمل میں ڈھالنے کا مظاہرہ کر کے وہ بلند مقام حاصل کیا جو اس مکتب فکر کے ہم عصروں میں شائد ہی کسی کو حاصل ہوا ہو۔

یوں تو مخدوم کا رشتہ دنیا بھر کے مظلوم محنت کش عوام سے قائم تھا لیکن ایک رشتہ اس مٹی سے بھی تھا جس کی گود میں وہ پلے، بڑھے اور پروان چڑھے۔ اس مٹی کی اپنی تاریخ تھی، اپنی روایات تھیں۔ اپنی خوشبو تھی! سوندھی اور مست کردینے والی، محبتوں سے معمور خوشبو! انھوں نے اس سرزمین کے گیت گائے اور کہا :

وشت کی ہر رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی رنگ کی برسات یہیں سے نکلی

انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

انھوں نے جو بات "بھاگ متی" کے حوالے سے کہی تھی آج وہی بات ان کے حوالے سے بھی کہی جاسکتی ہے۔

شہر باقی ہے محبت کا نشاں باقی ہے
دلبری باقی ہے دلداری جاں باقی ہے

سرفہرست نگاران جہاں باقی ہے
تو نہیں ہے تیری چشم نگراں باقی ہے

اس دیار کی مٹی نے مخدوم کو پیار کرنا سکھایا۔ بے غرض پیار! وہاں کے بسنے والوں سے ٹوٹ کر پیار کیا۔ اسی پیار نے انھیں لیڈر بننے پر مجبور کیا۔ اسی پیار نے ان کی ذات میں چھپے ہوئے شاعر کو ظاہر کیا۔ مخدوم دکن دیس کے لئے تھے اور دکن دیس

مخدوم کے لئے! ایسا شاذو نادر ہوا ہے کہ دیس کے بسنے والوں نے کسی فرد سے بغیر ملے اسے اپنا سمجھا ہو اور اس نے بھی کسی فرد کو اجنبی نہ جانا ہو۔ مخدوم سب کے لئے تھے اور سب مخدوم کے اپنے تھے۔ قسام ازل نے مخدوم کو کچھ نہ دیا سوائے محبتوں سے بھرے ایک دل کے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روز ازل جب لوٹ مچی تو مخدوم نے محبت کا سارا خزانہ لوٹ لیا۔ وہ زندگی بھر اس متاع عزیز کو لٹاتے رہے پھر بھی اس میں کبھی کمی نہیں آئی۔ اپنا ہو یا پرایا' نرم لہجہ' ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ' باتوں میں سچائی کی خوشبو! دکن دیس کے باسی ان پر مٹتے تھے وہ دکن دیس کے باسیوں پر' یقین نہ آئے تو زینت ساجدہ گواہی دینے کو موجود ہیں :

''مغلپورہ کے نوابوں سے لے کر چکڑپلی کے مزدوروں تک جس کو دیکھئے فیشن سا بنالیا ہے مخدوم کی محبت میں مرے جارہے ہیں'' (رسالہ صبا: مخدوم نمبر: ص ۱۹۹)

''حیدر آبادیوں کی تو خیر مخدوم کمزوری بن گیا ہے۔ افیون کی طرح وہ اس کے عادی ہوگئے ہیں'' (ایضاً)

وہاب حیدر ایک صحافی اور کارٹونسٹ تھے۔ وہ مخدوم سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں لڑکا تولد ہوا تو انھوں نے نام رکھنے کے لئے مخدوم کے پہلے مجموعہ کلام کا سہارا لیا۔ کتاب کھولی اور آنکھیں بند کرکے ایک جگہ انگلی رکھ دی دیکھا تو لکھا تھا ''حیات نو'' یہی بچے کا نام قرار پایا۔ سلیمان اریب نے اعتراض کیا اور دوبارہ نام تلاش کرنے کے لئے کہا۔ مخدوم موجود تھے ان کی رگ ظرافت پھڑکی تو انھوں نے اریب کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ''بس یہی نام ٹھیک ہے۔ نظموں میں ''مارو کژدم'' ''گدھ'' ''سوسمار'' ''خنازیر'' ''موذی'' اور ''عزرائیل'' جیسے الفاظ بھی ہیں۔ ان میں سے کوئی نکل آئے تو کیا ہو؟''

دکن دیس والوں نے چاہا تو اس طرح کہ نوجوانوں کا حلیہ' جسامت یہاں تک کہ وزن بھی مخدوم کے برابر' نہ کم نہ زیادہ! بال مخدوم نے مجبوری میں چھوڑ رکھے تھے کہ حجامت کے لئے وقت تھا نہ پیسے' حیدر آبادیوں نے اس کو فیشن بنالیا۔ یہ اس لئے نہیں ہوا کہ مخدوم کو لوگ بڑا آدمی سمجھتے تھے بلکہ اس لئے ہوا کہ وہ مخدوم کو اپنا سمجھتے تھے۔ ان کے پیار نے کیسے کیسے سنگلاخ دلوں کو تسخیر کیا تھا۔ دکن دیس والوں کی

بات چھوڑیں "غیر ملکی" بھی ان کے دام محبت کے اسیر تھے حکیم یوسف حسین ایڈیٹر نیرنگ خیال نہ تو مخدوم کے مسلک کے تھے اور نہ مشرب کے۔ وہ بیان کرتے ہیں :

"اس زمانہ کا تذکرہ ہے جب تلنگانہ کا رزمیہ ابھی جاری تھا اور نہایت زور و شور کے ساتھ اس کے شاہنامے کانوں میں گونجا کرتے تھے۔ میں مقابلتہ آتش مزاج ہوں کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ مخدوم لیڈر ہیں تو آنے دو۔ ان سے بھی نمٹیں گے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے لیڈر بھگت چکا تھا۔ سب نے مجھ پر لعنت بھیجی تھی اور کوئی دوراہے پر، کوئی سہ راہے پر، اور کوئی چوراہے پر بلکہ بعض تو صراط مستقیم پر بھی بے سہارا چھوڑ کر اپنی اپنی سمت نکل گئے۔ مجھے یقین تھا مخدوم صاحب سے ملا تو وہ بھی دیر یا سویر کبھی نہ کبھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ پنچ سالہ منصوبے کی طرح مجھ پر بھی خدا کی مار ہے۔ لیکن مخدوم سرخ سویرا سے باہر آئے اور ان سے ملاقات ہو سکی تو میرے منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ وہ جب ملے تپاک سے ملے، جب بات کی خلوص ہی کی بات کی۔ نہ کبھی انھوں نے رعب گانٹھا نہ اپنے نظریے کو آج تک مجھ پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔ انھوں نے جھوٹے منہ بھی کبھی ظاہر نہ کیا کہ مجھے اپنا ہیرو بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس معاملہ میں ان کی لاپروائی اب بھی آخری حدوں کو چھوتی ہے اور آج بھی جب میں ان سے ملتا ہوں تو یہ سوچنے لگ جاتا ہوں کہ آخر یہ کیسا لیڈر ہے کہ سارے غیر لیڈرانہ صفات ایک ہی ذات میں جمع ہوگئے ہیں۔ مخدوم صرف مخدوم ہی رہتے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مخدوم صاحب سے ملتے ملتے اتنی تبدیلی تو مجھ میں آتی جا رہی ہے کہ اور بہت سی باتوں میں میں رفتہ رفتہ شریعت مخدوم کی پابندی کرنے لگا ہوں۔ ان ہاتھوں میں پیار کی نرمیاں اتنی ہیں کہ دل بڑھتا ہی بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ دوسری تمام فاضل حدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور اس مرحلہ پر جب پیار کی چاندنی جگمگانے لگتی ہے، تو پھر

اور کچھ نہیں سوجھتا۔ بس انسان یہی سوچتا ہے کہ کہاں کی پیری کہاں کی مریدی' بھاڑ میں جائیں یہ بندھن اور تصنع۔ ہمدمو! ہاتھ میں ہاتھ دو' سوئے منزل چلو' اور منزلِ بھی دار کی نہیں پیار کی ہو" (رسالہ صبا' مخدوم نمبر: ص ۲۳۴)

مخدوم ہر ایک سے انتہائی اپنائیت سے ملتے ہیں یہاں تک کہ ملنے والے کو یقین ہوجاتا ہے کہ مخدوم ان کے سوا دنیا میں کسی سے محبت نہیں کرتے اس معاملہ میں کوئی تخصیص نہ تھی نام آوروں کی محفل میں وہ گم ناموں کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ سڑک پر گذرتے کوئی سلام کرتا رک جاتے۔ سائیکل پر ہوتے تو اتر پڑتے۔ سلام کا جواب' مصافحہ' خیر خیریت ہر بات میں دلجوئی کا پیار بھرا انداز ہوتا۔

موجیت سین لکھتے ہیں :

"۱۹۵۴ء میں جب وہ مجھ سے پہلی بار ملے تو انھوں نے شرارت سے بھرے ہوئے بعض ایسے الفاظ کہے کہ قہقہوں کا ایک طوفان سا چھوٹ پڑا۔ یہ الفاظ زندگی اور اس کی مسرتوں کی نمائندگی کررہے تھے' اس جذبہ خلوص کی جو ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے قریب کردیتا ہے۔ مجھ پر ہی کیا موقوف ہے مخدوم ہر شخص سے اس طرح کھلے دل کے ساتھ ملا کرتے تھے" (رسالہ نیا آدم' مخدوم نمبر: ص ۵۵)

آندھرا سبھا کے اولڈ گارڈ' پارٹی کے سینئر لیڈر روی نارائن ریڈی نے مخدوم سے جس اپنائیت کا اظہار کیا ہے اس سے بڑھ کر کون کرسکتا ہے' کہتے ہیں :

"بھئی مخدوم کو میں کب سے جانتا ہوں یہ بتانا میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم دونوں کا جنم ایک ہی دن میں ایک ہی گھر میں ہوا تھا"

مخدوم نے کمیونسٹ ممالک کا سفر کیا۔ براٹس لاوا (چیکوسلواکیہ) میں چند گھنٹوں کا قیام ہوا۔ وہ شلاز کے مہمان بنائے گئے تھے۔ ان کی سہولت کے لئے ایک کار اور ڈرائیور بھی فراہم کیا گیا تھا۔ چند گھنٹوں کی شناسائی کے بعد

"شلاز مجھے آسٹریا اور سویت کی مشترک چوکی میں لے گئے وہاں

سفید بالوں والی عورت ساتھی ڈبلیو' ایف' ٹی' یو (دنیا کے مزدوروں کی
انجمن) کی طرف سے مجھے لینے کے لئے موجود تھی۔ ایک دوسرے
سے رخصت ہونے کا لمحہ بھی آپہنچا۔ گو تھوڑی دیر کی دوستی تھی مگر
سب دل گرفتہ تھے کہ اب جدا ہونا ہے مصافحہ کیا' بغل گیر ہوئے'
شلاز نے کسی قدر ضبط سے کام لیا مگر ڈرائیور ساتھی کی آنکھیں بھر
آئیں اور بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔" (مخدوم محی الدین: "اجنبی"
اخبار سیاست حیدر آباد دکن: ۱۹۵۷ء)

ان میں ضرور ایسی کوئی بات تھی کہ اپنے اور پرائے
دیس کے' غریب اور امیر' جاہل اور دانشور سب ان سے مل کر وارفتہ ہوجاتے۔ اس
میں مردوں کی بھی تخصیص نہیں۔ عورتوں کا بھی یہی حال تھا۔ سب عورتیں (جن کی
عمروں کی کوئی قید نہیں) ان کی دیوانی تھیں۔ چند ان کی شاعری کو پسند کرتی تھیں' چند
ان کے ترنم پر مٹی جاتی تھیں۔ چند ان کے کارناموں کی قصیدہ خواں تھیں' چند ان
کی شخصیت پر واری جاتی تھیں۔ ان کی ذات کی ایک ایک جہت نے الگ الگ
گروہوں کو تسخیر کیا تھا یہاں تک کہ واجدہ تبسم اردو کا قاعدہ بدلنے پر تیار ہوگئیں۔

"اردو کے قاعدے میں میم سے بھلے ہی کچھ ہو۔ میں میم سے مخدوم' اور میم
سے محبت جانتی ہوں" (رسالہ صبا' مخدوم نمبر: ص ۲۴۰)

مخدوم کی زندگی کا مقصد ہر ایک سے محبت کرنا اور ہر ایک کی محبت جیتنا تھا۔ یہ
ان کی خوش نصیبی ہے کہ انھوں نے جس شدت سے دوسروں کو چاہا اس سے کہیں
زیادہ ٹوٹ کر دوسروں نے ان سے محبت کی۔ وہ کس کا دل دکھانا جانتے ہی نہ تھے
جہاں تک ممکن ہوا اپنے چاہنے والوں کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کو پورا کیا اور اس عمل
میں اپنی بے پناہ مصروفیات کو حائل نہ ہونے دیا۔ اگر واجدہ تبسم نے اردو کے
قاعدے میں ترمیم کی ہے تو وہ بے جا نہ تھی۔" کیونکہ بقول خود ان کے :

"میں تو اس مخدوم کو جانتی ہوں جو دہلی کے جاڑوں میں میرے
پاس سوئٹر نہ دیکھ کر کانفرنس سے اٹھ کر شال خرید لایا۔ جس نے
میری انگلی میں پن چبھ جانے کے سبب اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر

مجھے کھانا کھلایا۔ جس نے سراپا محبت نقاد بن کر فن کو سراہا" (ایضاً)

قمر ساحری کو ضد تھی کہ وہ دولہا اسی وقت بنیں گے جب مخدوم سہرا باندھیں گے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس پر خلوص خواہش کو وہ رد کر دیتے تھے۔ سو کام چھوڑ کر وہ آئے اپنے ہاتھوں سے سہرا باندھ کر قمر ساحری کی خواہش پوری کی۔ یہ تو ہوئی اپنوں کی بات! بھلا اپنوں کی بات کو کون ٹالتا ہے!! مخدوم کا رویہ اجنبیوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ بغیر کسی امتیاز کے ہر ایک کی دلجوئی کرتے اس حوالہ سے ایک واقعہ کا ذکر بارہا کیا گیا ہے اسے مرزا ظفر الحسن کے الفاظ سنئے :

> "دہلی کی ایک محفل میں اپنی جوانی کی نظم "انتظار" سناتا ہے جس پر نہ جانے کتنی جوانیاں نثار ہونے کو تیار تھیں۔ ایک دوشیزہ اس نظم سے متاثر ہوئی اور مخدوم سے التجا کرتی ہے کہ وہ اس کے محبوب کو جو دہلی سے کوئی تین سو میل دور انبالے میں مقیم ہے یہ نظم سنائے تاکہ اس کا محبوب آجائے اور اس دوشیزہ کے سجدوں کا ارمان نکلے بلکہ اس کے قدموں پر اس کی جان نکلے۔ مخدوم ٹریڈ یونین کا کام ملتوی کر دیتا ہے کمیونسٹ پارٹی کے فرائض بھول جاتا ہے۔ دوسری تمام سرگرمیوں کو بھی بالائے طاق رکھ کر اس دوشیزہ کے محبوب کو ٹیلی فون پر اپنی رومانی نظم اپنے خاص لحن میں سناتا ہے یہ نظم سن کر کیا معلوم کون رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتا رہا اور سانس کی طرح سے آتا رہا جاتا رہا" (ذکر یار چلے: ص ۸۲۔۸۳)

لوگ کہیں گے محبتیں جیتنا بڑی بات نہیں۔ موجودہ زمانہ میں یہ بھی لین دین کا کاروبار ہے۔ محبت جتاؤ اور محبت جیتو! اس عامیانہ فلسفہ کو مان بھی لیا جائے تب بھی اس حوالہ سے مخدوم کو ایک امتیاز اور حاصل رہا' انھوں نے محبت کے ساتھ اعتماد بھی حاصل کیا۔ اعتماد بھی ایسا جو ایقان اور ایمان کے درجے کو پہنچا ہو۔ مزدوروں نے' کسانوں نے' محنت کشوں نے' عوام نے ان پر جس حد درجہ اعتماد کیا اس کی مثال ماضی قریب کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ انفرادی اور اجتماعی اعتماد کے وہ زندگی پر حاوی

رہے۔ عام مزدور کا ذکر کیا لڑکیاں اور ان کے سرپرست بھی مخدوم پر کامل اعتماد رکھتے تھے وہ نوجوان لڑکیوں کے جھرمٹ میں فقرے بازی کریں' لطیفہ گوئی کریں' ہنسیں ہنسائیں اس پر کوئی معترض نہ ہوتا تھا سب جانتے تھے کہ ان کی زبان سے لغزش ہوگی اور نہ ان کے عمل سے! زینت ساجدہ لکھتی ہیں :

"کوئی گھر ایسا نہیں جہاں وہ جا نہ سکتا ہو۔ عورتوں میں عورت' مردوں میں مرد' سیاست دانوں میں اپوزیشن لیڈر اور بچوں میں سرکس کا مسخرا۔ میں نے بارہا نہایت گھریلو قسم کی عورتوں سے بگھارے بیگن یا انڈوں کے کٹ کی فرمائش کرتے اور انباڑے کے اچار کی ترکیب پوچھتے سنا ہے" (رسالہ صبا' مخدوم نمبر: ص ۲۰۱)

فاطمہ عالم علی خاں بتلاتی ہیں کہ اردو ہال سے لوٹتے ہوئے دیر ہو جاتی' اندھیرا چھا جاتا۔ وہ اکیلی ہوتیں تو مخدوم پوچھتے "کیسے جاؤ گی" اور خود ہی کہہ دیتے "اچھا چلو تمھیں پہنچاتا ہوا چلا جاؤں گا" گویا تنہا لڑکیوں کو گھر تک پہنچانا بھی ان کی ذمہ داری میں شامل تھا۔

زینت ساجدہ' واجدہ تبسم' فاطمہ علی اور ایسی ہی سینکڑوں لڑکیوں سے ان کا رشتہ تھا بہن بھائی کا؟ باپ بیٹی کا؟ نہیں یہ سب بہت چھوٹے رشتے ہیں۔ مخدوم کا جو رشتہ خواتین سے تھا اس کے لئے کوئی نام ایجاد نہیں ہوا ہے۔ خواتین کی محفلوں میں بے تکلفی کے ساتھ وقت گذار کر مخدوم بدنام ہوئے اور نہ خواتین! کسی نے انگشت نمائی کی اور نہ اعتراض! سب ہی جانتے تھے کہ عامیانہ جذبات سے عاری شخص کا نام ہی مخدوم ہے۔

یوں تو مخدوم کا رشتہ دنیا بھر کے عوام' مظلوم' محنت کش طبقوں سے تھا۔ اس بات کا انھوں نے نظری اور عملی ثبوت پیش کیا۔ اس سے بڑھ کر ایک رشتہ اس مٹی سے بھی تھا جس کی گود میں وہ پلے اور بڑھے تھے۔ جس کی سوندھی خوشبو میں انھوں نے سانس لیا تھا۔ جس کی فضاؤں نے انھیں بولنا' شعر کہنا اور محبت کرنا سکھایا تھا۔ انھوں نے برصغیر کے شہر شہر دیکھے ایک دنیا کی سیاحت کی' کسی جگہ کی رونقیں ان کے دل سے دکن کی محبت' اس کی روایات اور زندگی کے رنگ ڈھنگ کو نہ چھین سکیں۔

روپیہ پیسے کی چمک دمک نے ان کی آنکھوں کو خیرہ نہ کیا۔ دنیا بھر میں ملنے والی عزت ان کے دل سے دکن کی مٹی کے پیار کو فنا نہ کر سکی۔ وہ شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے اور اس طبقہ کے لئے سنہرے جال بمبئی میں ایجاد ہوئے۔ کون کون بلند پرواز اس جال میں نہیں پھنسا اور آب و دانہ کے لئے بلبل بن کر نہیں رہا۔ لیکن ایک مخدوم تھے جو اسیر دام نہ ہوئے۔ واقف کار لکھتے ہیں :

> "۱۹۵۸ء میں مشہور فلم ساز گرودت نے انھیں مستقل طور پر بمبئی میں رہ کر گیت لکھنے کی دعوت دی اور اتنے معاوضے کی پیشکش کی جو اس زمانہ کے سب سے زیادہ دیے جانے والے معاوضہ سے تقریباً دگنا تھا پھر بھی مخدوم بمبئی میں رہنے کے لئے راضی نہ ہوئے۔" (رسالہ صبا' مخدوم نمبر: ص ۳۴)

مخدوم کا کمٹ منٹ اپنی زمین سے تھا عوام سے تھا اپنے چاہنے والوں سے تھا۔ وہ سمجھتے تھے ان سب کا قرض ان پر واجب الادا ہے اور ساری زندگی یہی قرض ادا کرنے میں گزار دی۔

وہ عہد گذشتہ کی تہذیب اور روایات کے امین تھے انقلاب پسندی کے باوجود اعلیٰ اقدار کی ہمیشہ پاسبانی کی اور اس کی پروا بھی نہ کی کہ ان کے سر پر قدامت پسندی یا روایت پرستی کا الزام بھی آسکتا ہے۔ ساتھ ہی ان میں جرات اظہار بھی تھی۔ اپنی قوت فیصلہ سے انھوں نے جس بات کو خیر جانا اس کو بہ بانگ دہل اعلان کیا اور جسے شر سمجھا اس کی بھری محفل میں مخالفت کی۔

سرور ڈنڈا کی یاد میں حیدر آباد دکن میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ مخدوم اس کی صدارت کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے سخن طرازی کے شوق میں اپنے وطن کا مذاق اڑایا۔ یہ بات مخدوم کو ناگوار گذری۔ انھوں نے شاعر کو کلام سنانے سے روک دیا۔ بھرے مجمع میں بلند آواز سے اسے ڈانٹا اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔ شاعر میں حوصلہ نہ ہو سکا کہ وہ اپنی مدافعت میں زبان کھول سکتا۔ اس نے احتجاج کئے بغیر مخدوم کے حکم کی تعمیل کی۔ انھوں نے محفل سے مختصر سا خطاب کیا اور آداب محفل اور آداب

مشاعرہ سے آگاہ کیا۔ یہ ان کا وقار اور ان کی اصول پسندی کا کمال تھا کہ لوگوں نے ان کی تعریف کی ان کے موقف کو سراہا اور ان کی ڈانٹ کو ضروری خیال کیا۔

معاشرتی تہذیب اور مجلسی آداب کی روایت کی پاسبانی کے حوالے سے ایک واقعہ پرکاش پنڈت نے بھی ان کے کلام کے ہندی ترجمہ کو شائع کرتے ہوئے پیش لفظ میں لکھا ہے:

> ''اردو کا پرسدھ پر گتی شیل شاعر اور مخدوم کا پرم متر مجاز لکھنؤی سبھاؤ انا سار ایک مشاعرے میں اس بری طرح شراب پی کر آیا کہ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور اس کے منہ سے شبد نہ نکلتے تھے۔ اپنی مترتا کے باوجود مخدوم نے مائیکروفون تھام کر مجاز کو بری طرح ڈانٹنا شروع کردیا ''تم اپنی کلا کویتا پرکاش لے کر جنتا کے اندھیرے دلوں میں اترتے ہو۔ اتیا چاری شاسک ورگ نے انھیں ودیا، ساہتیہ، سبھیتا اور سنسکرتی سوگنوں سے ونچت کر رکھا ہے۔ وے پیاسوں کی طرح تمہارے گرد ا یکتر ہوجاتے ہیں۔ انھیں تمہارے شراب کے بھبکوں کی آوشکتا نہیں۔ ان کے جیون میں پہلے ہی بہت سی گندگیاں ہیں۔''

اس واقعہ کا ذکر سردار جعفری نے بھی ''ادب کے نئے معمار۔ مخدوم'' (ص ۱۸) میں مختلف انداز میں کیا ہے اور پاس دوستی میں مجاز کا نام حذف کرگئے ہیں۔ سردار جعفری کا یہ خیال درست ہے کہ ''مخدوم محتسب نہیں'' وہ محتسب کے بجائے تہذیب کی پاسبانی اور پاسداری کا فرض ادا کرتے تھے اور اس حوالہ سے کسی لغزش کو معاف نہیں کیا۔

مجاز پر یہ اعتراض نہیں تھا کہ وہ مئے نوشی کرتے تھے اعتراض تھا بدحالی اور انتہائی مستی کے عالم میں محفل میں در آنے پر شاعر تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ ترقی پسند شاعر آدرشوں کے پرچارک سمجھے جاتے تھے۔ جو اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو وہ نہ تو تہذیبی اقدار کی پابندی کرسکتا ہے اور نہ اس کے آدرش پر سامع کی توجہ مبذول ہوسکتی ہے۔

یہ بات بھی نہیں کہ مخدوم مے نوش نہیں تھے۔ معاشرتی نقطہ نظر سے ہر عمل میں دوباتوں کا خیال رہنا چاہیے ایک یہ کہ عمل حد اعتدال سے نہ بڑھے اور دوسرے یہ کہ اس کا اثر معاشرہ پر نہ ہو۔ مخدوم نے ان دونوں باتوں کا ہمیشہ خیال رکھا۔ان کی مے نوشی ان کی ذات اور چند احباب تک محدود رہی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہوں یا عالم مدہوشی میں محفل یا مشاعرے میں چلے آئے ہوں اور لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع ملا ہو۔ ان کی نشاط آفرینی کے بارے میں راج بہادر گوڑ کا بیان ہے :

"مخدوم بنت عنب کو زندگی کی مہک اور چمک سمجھتے تھے۔ وہ شراب کو پناہ گاہ نہیں سمجھتے تھے جہاں آدمی دکھ درد سے فرار کی خاطر سکر و مستی کا سہارا لیتا ہے۔ مخدوم پینے کے دوران نزاعی موضوعات سے گریز کرتے تھے کہ کہیں محفل بدمزہ نہ ہوجائے۔ انھیں اپنی حد سرخوشی کا علم تھا اور کبھی اس حد سے گذر جانے کی منزل آجاتی تو وہ اپنے کو سنبھال کر چپکے سے اٹھ کر گھر چلے جاتے۔" (بحوالہ مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے' از شاذ تمکنت : ص ۳۴،۳۵)

اقدار اور اصولوں کی پابندی کے حوالے سے عابد علی خان نے بھی ایک واقعہ تحریر کیا ہے :

"مخدوم جشن غالب کمیٹی کے ایک اہم رکن تھے۔ موسیقی کے پروگرام میں جب ایک بڑی آرٹسٹ نے غالب کی غزل کے بجائے کوئی گیت شروع کیا تو مخدوم نے اس پر پہلے اعتراض کیا اس کے باوجود دوسری مرتبہ گیت شروع ہوا تو مخدوم نے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال سے یہ کہتے ہوئے "واک آؤٹ" کیا کہ یہ غالب کو کوئی خراج تحسین نہیں ہے۔"

مخدوم جیسا اصول پسند شخص ہی مصلحتوں سے بالاتر ہوکر حق گوئی کا فرض ادا کرسکتا ہے۔ وہ سچائی کے پرستار اور برائی کے سخت دشمن تھے۔

مخدوم شاعر تھے اور بلاشبہ اچھے شاعر تھے۔ باوجود اس کے ان میں شاعروں کے

جیسے چلن نہ تھے۔ انھوں نے اچھے شاعر ہونے کے زعم کو اپنے اوپر کبھی طاری نہ کیا۔ اسی پر کیا موقوف، وہ لیڈر تھے عوام میں مقبول تھے ان کا زعم بھی ان کی شخصیت کا حصہ نہ بن سکا۔ اپنی تمام کامیابیوں کے باوجود اور شہرت و عظمت کی بلندیوں کو چھولینے کے باوجود اپنے مزاج، طور طریق، طرز زندگی اور معاشرتی تعلقات میں کوئی فرق پیدا نہ ہونے دیا۔ وہ سادگی پسند اور لا ابالی تھے۔ یہ اوصاف ان کی ذات کا حصہ بنے رہے، انھوں نے کلام شائع کروانے اور محفوظ کرنے کی کبھی فکر نہیں کی۔ ان سے جو کچھ یادگار باقی رہ گیا ہے وہ ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کے ذوق و شوق کا نتیجہ ہے۔ انھیں شعر سنانے کا "ہوکا" بھی نہیں تھا۔ بے تکلفی کی محفلوں میں کچھ سنانے کی فرمائش کی جاتی تو اپنا کلام پیش کرنے کے بجائے حافظ یا غالب کا کلام سنانے لگتے۔ دوستوں کو اپنی کوئی تازہ نظم اس شوق سے نہ سنائی ہوگی جس شوق سے فیض کی تازہ نظم سناتے تھے۔

ان کا ترنم لاجواب تھا۔ اس کیف میں شعر سناتے کہ مجمع خود شعر خوانی میں ہم آواز ہو جاتا۔ زینت ساجدہ نے ترنم کے سدا قائم رہنے والے آہنگ اور دلپذیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اصل میں ان کی آواز میں جادو ہے۔ گہری، طرح دار، خراد پر چڑھتی ہوئی آواز۔ جب غزل چھیڑتا ہے تو آپ ساز بن جاتا ہے اور اماوس کی رات میں گویا دیپک سا جل اٹھتا ہے۔ مجھ سے عرب ملکوں کی سیاحت کر کے آنے والے ایک سیاح نے کہا "آہ! کلثوم کیا آواز اس کی ہے۔ ساٹھ برس کی ہو چکی مگر اس کی آواز کا جادو نہیں ٹوٹا" میں نے کہا "آپ نے مخدوم کو نہیں سنا۔ ساٹھ برس سے تو ہم ہی سن رہے ہیں مگر آواز کا کلف ہی نہیں ٹوٹا بلکہ ابرق بھی چمکنے لگی ہے۔"

وہ مشاعرہ باز تھے اور نہ محفل کے رسیا۔ ہجوم سے کتراتے اور بے تکلف دوستوں کی نجی نشست کو ترجیح دیتے تھے۔ ان بے تکلف دوستوں کے درمیان ان کے اندر کا خوش مزاج، ہنس مکھ، لطیفہ باز، بذلہ سنج، فقرہ باز جاگ اٹھتا اور نہ رکنے والی

زبان کے وہ جوہر دکھلاتا کہ شرکاء کی ہنسی رکنے پر نہ آتی۔ ان کی خوش طبعی اس وقت بھی قائم تھی جب وہ طالب علم تھے اور کئی دن فاقوں میں گذر جاتے تھے۔ زندگی اور زمانہ کا اس قدر مردانہ وار مقابلہ کسی اور نے کہاں کیا ہوگا؟ حیدرآباد دکن میں لطائف جمال الدین سے منسوب کرنے کا رواج عام رہا۔ موصوف باغ عامہ کے مہتم تھے۔ مخدوم نے ان کا انتخاب لطائف کے بنیادی کردار کے طور پر کیا تھا۔ ادھر مخدوم نے لطیفہ تصنیف کیا اور ادھر جمال الدین کے نام سے منسوب ہوکر سارے شہر میں پھیل جاتا وہ اپنے دوستوں کی محفل میں ہوتے تو وہ قہقہہ زار بن جاتی۔ باتوں کا شور اس پر مستزاد ہوتا۔ زندہ دلی ان کی فطرت کا حصہ تھی۔ غم و اندوہ کی انتہائی حالت میں بھی وہ اس کے مظاہرہ سے باز نہیں آتے ان میں آنسوؤں کو ضبط کرنے اور سسکیوں کو سینے میں دبالینے کا حوصلہ تھا۔ اشفاق حسین ان کے جامعہ کے ساتھیوں اور خلوتوں کے شریک تھے ان دونوں کے درمیان فقرہ بازی اور لطیفہ گوئی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ وہ مخدوم کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ ان کے تجربہ نے انھیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ :

> "اس کا (مخدوم کا) ہمیشہ یہ شعار رہا کہ اپنی بذلہ سنجیوں سے لمحات لطف و انبساط دوستوں کو بخشتا جاتا۔ زندگی نے جب بھی مہلت دی وہ اسی طرح دوسروں کو نہال کرتا رہا اور کہتا رہا "یارو ہنستے رہو اور ہاتھ ملاتے رہو کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے"۔ یہ لمحے ہی تو اندھیروں میں کبھی کبھی دم شعلہ ساز کا کام دے جاتے تھے۔ اندھیروں میں اس طرح اجالا کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ چاہے اجالا قہقہوں سے ہو یا جنون عشق کے سوز و گداز سے۔" (رسالہ صبا: ص ۹۴)

دوستوں کی بزم آرائی میں جو لطیفے ایجاد ہوئے یا فقرے چست کیے گئے اگر یکجا کیے جاتے تو وہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہوتے۔ کبھی کبھی وہ عملی مذاق نہایت سنجیدگی سے کرتے اور اس کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہتا۔ باہر سے آئی ہوئی ایک خاتون نے ان سے متاثر ہوکر پوچھا تھا کہ "آخر وہ کرتے کیا ہیں"۔ مخدوم نے نہایت سنجیدگی سے بتلایا کہ وہ مفلوک الحال، فاقہ زدہ بیرزگار ہیں۔ نوکری کی تلاش میں سرگرداں، لیکن ہر

جگہ نا امیدی کے شکار! خاتون کو ان پر رحم آگیا۔ انھوں نے اظہار ہمدردی کے علاوہ ان کے لئے نوکری کا بندوبست کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ ان کی صحبت میں مخدوم نے خاصہ وقت گذارا لیکن اصلیت ظاہر نہ ہونے دی اور دل ہی دل میں مزے لیتے رہے۔

بے تکلف محفل آرائیوں میں بھی ان کا آورش ان کے سامنے رہتا۔ وہ خود کام کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے ۔ اپنے ساتھیوں اور جونیئرز کو بے مقصد زندگی گذارنے کے بجائے با مقصد لائحہ عمل پر کاربند کرنا بھی ان کے مشن کا حصہ تھا۔ انھوں نے نوجوانوں کو علمی' ادبی' تہذیبی' صحافتی' سیاسی اور نظریاتی مورچوں پر کام کرنے کے لئے غیر شعوری طور پر اکسایا۔ ان کی تربیت کی' ان کے شانے سے شانہ ملا کر آگے بڑھے اور انھیں آگے بڑھنا سکھایا۔ مخدوم کا دور ان کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ ان سے فیض صحبت پانے والے آج بھی موجود ہیں اور ان کے بتلائے ہوئے راستوں پر گامزن ہیں۔ مخدوم نہیں رہے ان کی جلائی ہوئی شمعوں کو ان سے پیار کرنے والے آج بھی اپنے خون دل سے روشن کئے ہوئے ہیں' آدمی کی بڑائی یہ نہیں کہ اس نے بڑے کام کئے بلکہ بڑائی یہ ہے کہ اس کے نقش قدم اتنے دیرپا ہوں کہ آئندہ نسلیں انھیں نشان منزل بنائے رکھیں۔ اس اعتبار سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ مخدوم ایک بڑے آدمی تھے۔

تیسرا باب

نثر نگاری

۱۔ ہوش کے ناخن:

یہ تین ایکٹ کا ڈرامہ ہے جو برنارڈ شاہ کے ڈرامے "وڈورس ہاؤس" سے ماخوذ ہے۔ میر حسن اور مخدوم نے مشترکہ طور پر تحریر کیا تھا۔ مرزا ظفر الحسن کا بیان ہے کہ "انہوں نے اپنے استاد پروفیسر حسن علی خاں کے مشورہ دینے پر لکھا ہے" (عمر گذشتہ کی کتاب ص ۲۰۸) فضل الرحمن سابق پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بیان کے مطابق شا کے ڈرامے کے برابر برابر دو حصے کئے گئے جنھیں مخدوم اور میر حسن نے بانٹ لیا تھا دو قلم کاروں کی کاوش ہونے کے باوجود مکالموں کی نوعیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ "ہوش کے ناخن" ۲۱ دسمبر ۱۹۳۴ء کو سالانہ جشن عثمانیہ کے سلسلہ میں لیاقت منزل (ہاسٹل) میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ ناظرین میں مہاراجہ کشن پرشاد' سر اکبر حیدری' رابندر ناتھ ٹیگور' اور مسز سروجنی نائیڈو بھی تھے۔ یہ پہلا مسائلی کھیل تھا جس میں دکنی معاشرے کی جھلکیاں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ پیش کی گئی تھیں اس وقت کی معاشرت پر طنز سب سے پہلے اس کھیل میں کیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ سوئیاں چبھوئی گئیں اور سمجھا گیا کہ گدگدی کی گئی۔ مولوی کو پیش کیا گیا مگر لوگ اسے ایک مسخرہ سمجھے۔ کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوا کہ بدیسی کہانی اور بدیسی موضوع کو اپنایا گیا ہے۔ مکالموں میں بلا کی شگفتگی' روانی' اپج اور جگہ جگہ مقامی رنگ جھلکتا تھا۔ ماحول اپنا' کردار اپنے بھائی بند' اور واقعات دکن دیس کی کہانیاں۔ ہوش کے ناخن دیکھنے اور پڑھنے کے بعد کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مخدوم اور میر حسن کی اس تخلیق میں جارج برنارڈ شا کا بھی کوئی حصہ ہے"۔ (مرزا اظفر الحسن' شہر نگاراں ص ۲۱)۔ بندہ علی اور شبرنگ کے مکالموں میں خصوصیت سے دکنی زبان استعمال کی گئی ہے۔

ڈرامے میں کام کرنے والے : غضنفر' ایک کاروباری شخص (محمد یحییٰ صدیقی)' بلقیس' غضنفر کی بیٹی (مرزا اظفرالحسن)' شمشاد' نوجوان' بلقیس کا عاشق (میر عباس علی خاں)' قاری' شمشاد کا دوست (مخدوم محی الدین)' بندہ علی' غضنفر کا کارندہ (جمیل احمد فاروقی)' شبرنگ' بلقیس کی خادمہ (محمد عبداللطیف)' ویٹر (غلام علی)

کامیاب اداکاری کے لئے انعامات دئے گئے تھے۔ مخدوم کو پہلا انعام ملا۔ ڈرامہ "ہوش کے ناخن" ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن نے شائع کیا۔ جس میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری کے دیباچے بھی شامل ہیں۔ پہلے صفحہ کی عبارت ہے۔ " سلسلہ ادبیات اردو شمارہ (۲) مدیر عموی محی الدین قادری زور' پروفیسر زبان اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ' "ہوش کے ناخن" حیدر آباد کی سماجی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ایک صحیح مرقع' مصنفہ میر حسن بی۔ اے عثمانیہ۔ مطبوعہ احمد پریس' ابتدائی ۲۸ صفحات مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن ۱۹۳۴ء"

۲۔ مرشد:۔

مخدوم اور اس کی ساتھیوں نے "عثمانین" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کا مقصد ڈرامے تیار کرکے اسٹیج کرنا تھا۔ اسی کے لئے مخدوم نے مرزا ظفرالحسن کی فرمائش پر ایک ایکٹ کا مزاحیہ ڈرامہ لکھا جو طبع زاد تھا۔ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ میں زلزلہ آیا "عثمانین" کی جانب سے زلزلہ کے متاثرین کی امداد کے لئے اسے ایکسیلسیٹر تھیٹر (ساگر ٹاکیز کا پرانا نام) کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ ڈرامہ کا مسودہ ناپید ہے۔ جب یہ اسٹیج ہوا تو ایک تعارفی کتابچہ شائع کیا گیا تھا جو محمد یحییٰ صدیقی کے پاس محفوظ ہے اور شاذ تمکنت نے اپنی کتاب میں من و عن نقل کیا ہے اسی کے حوالہ سے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

> "مشتاق کالج کا ایک نوجوان طالب علم اس تمثیل کا مرکزی کردار ہے جو زندگی کے اٹل اور انوکھے نظریے رکھتا ہے۔ انقلابی خیالات اور شگفتہ طبیعت کی وجہ سے طلبا میں بہت مقبول ہے یہ دور جدید کے تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ کالج کے کچھ لڑکے جمع ہوتے ہیں اور مشورہ کرتے ہیں کہ آئندہ چھٹیاں کس طرح اور کہاں

گزاری جائیں۔ بحثیں ہوتی ہیں مگر برہان کو منانے میں سارا وقت گذر جاتا ہے۔ مشتاق آخر اپنا خیال پیش کرتا ہے کہ وہ ایک مرشد کی حیثیت سے سفر کرے گا تاکہ دین و دنیا میں سرخروئی حاصل کرے۔ سوائے احسان کے کوئی اس مہم کے لئے ساتھ نہیں دیتا۔"

"مولوی احترام علی پرانی وضع کے زمیندار' مشتاق کے ماموں ہیں۔ مشتاق کی نیچریت کی وجہ سے ناراض ہیں اور اپنی بیٹی انوری کی شادی اس سے نہیں کرنا چاہتے مگر مولوی احترام علی کی بیوی سکندر بیگم چاہتی ہیں کہ انوری کی شادی مشتاق ہی سے ہو۔ مشتاق' مولوی احترام علی پر اثر قائم کرکے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے "مرشد" کا سوانگ بھرتا ہے اور مولوی احترام علی کے مکان میں فروکش ہوتا ہے جہاں اس کی بڑی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ مشتاق یہاں سے ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ احترام علی اور سکندر بیگم دونوں گھر سے چلے جاتے ہیں۔ گھر میں صرف مشتاق اور انوری رہ جاتے ہیں--- پراسرار طریقہ پر اظہار محبت--- افشائے راز---!

افراد تمثیل "مرشد"

مشتاق : ایک آکھڑ طبیعت کا نوجوان طالب علم : محمد یحیٰی صدیقی ایم۔ اے عثمانیہ

احسان : مشتاق کا مرید : مرزا ظفرالحسن بی۔ اے عثمانیہ

برہان : کتابوں کا کیڑا : سید احمد رضوی بی۔ اے (عثمانیہ)

کرامت : اصول پسند سنجیدہ نوجوان : محمد غوث صدیقی ایم ایس سی (عثمانیہ)

رشید : بھرتی کا ٹٹو : مرزا مظہرالحسن

میر احترام علی : دقیانوسی وضع کا بڈھا زمیندار : مخدوم محی الدین بی۔ اے (عثمانیہ)

سکندر بیگم : احترام علی کی بیوی : شہریار کاوس جی (عثمانیہ)

انوری : مشتاق کی محبوبہ' احترام علی کی بیٹی : غزنوی (عثمانیہ)

فیروز : میر احترام علی کا نوکر : مرزا محمود الحسن
بہ سرپرستی والا شان نواب اعظم جاہ بہادر ولی عہد دولت آصفیہ۔

مصیبت زدگان کوئٹہ کی امداد میں "عثمانین" کی جانب سے "زلزلہ شو"
"مرشد" مصنفہ مخدوم محی الدین بی۔ اے (عثمانیہ) صدر
"ہوشربا" مصنفہ مرزا ظفر الحسن بی۔ اے (عثمانیہ) معتمد

مقام : ایکسلسیر تھیٹر
روز : پنجشنبہ ۴ شہریور
وقت : دس ساعت شب

مرزا ظفر الحسن بی۔ اے
(معتمد بزم ڈرامہ جامعہ عثمانیہ پیش کنندہ)

پشت پرنٹ۔
جنرل منیجر : میر حسن ایم۔ اے (عثمانیہ)
اسٹیج منیجر : جمیل احمد فاروقی ایم۔ اے (عثمانیہ)
بکنگ : شنکر جی بی۔ اے (عثمانیہ) محی الدین غازی (عثمانیہ)
۱۔ رضا کار : عبدالمجید رضوی بی ایس۔ سی (عثمانیہ)
۲۔ شہاب الدین بی۔ اے (عثمانیہ)
۳۔ علی احمد بی۔ اے (عثمانیہ)
۴۔ محی الدین ۵۔ خواجہ عبدالغفور ۶۔ کرار علی ۷۔ عبدالوحید رضوی
۸۔ جیونت راؤ ۹۔ خواجہ شوکت اللہ ۱۰۔ زنانہ ! مس ایم مچایا۔ (عثمانیہ)
آخری صفحہ پر پروگرام درج ہے۔
۱۔ گانا ۲۔ مرشد (وقفہ)
۱۔ آرکسٹرا ۲۔ ہوشربا (وقفہ)
۱۔ پیلا دوشالہ ۲۔ شکریہ
"الٰہی تا جہاں باشد شہنشاہ جہاں باشی"

(بحوالہ مخدوم، حیات اور کارنامے از شاذ تمکنت ص ۲۸۳ تا ۲۸۸)

مرزا ظفر الحسن "مرشد" کے اسٹیج ہونے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ :-

"میں نے کسی کے توسط سے شہزادہ اعظم جاہ ولی عہد کے دربار میں پہنچ کر ان سے اس "زلزلہ شو" کی سرپرستی کی درخواست کی جو انہوں نے منظور کرلی اور اس کے بعد ہم نے اخباروں میں اعلان کردیا اور اشتہارات وغیرہ بھی چھپواکر تقسیم کروئے جس دن یہ شو تھا اس صبح شہزادہ معظم جاہ یورپ سے واپس آرہے تھے۔ نام پلی اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت عثمان علی خاں تشریف لے گئے۔ شہزادہ اعظم جاہ اور تمام عمائدین سلطنت بھی حاضر تھے۔ اسی وقت شہزادے کی واپسی کی خوشی میں اعلیٰ حضرت نے ایک شاہی دعوت دی تھی۔ ایک طرف "زلزلہ شو" دوسری طرف شاہی دعوت! ولی عہد نے اعلیٰ حضرت کے کان میں بات ڈال دی کہ آج رات عثمانیہ کے لڑکے مصیبت زدگان کوئٹہ کی امداد اور میری سرپرستی میں "زلزلہ شو" کررہے ہیں اس لئے اگر اجازت ہو تو میں دعوت سے ذرا جلدی رخصت ہوکر زلزلہ شو میں چلا جاؤں۔ اعلیٰ حضرت نے جب عثمانیہ کے لڑکوں کا نام سنا تو پھڑک گئے انہیں بے پایاں مسرت ہوئی اور ایک ایک کو مخاطب کرکے فرمایا جیسا کہ ان کا طریقہ تھا بار بار دھرایا۔

"میرے بچے ڈراما کر رہے ہیں" "عثمانیہ کے لڑکے زلزلہ کے مصیبت زدگان کی امداد کر رہے ہیں" "میں بھی آؤں گا" "سب ڈنر کے بعد جائیں گے"

(مرزا ظفر الحسن! عمر گذشتہ کی کتاب: ص ۲۱۱، ۲۱۲)

ڈرامہ دیکھنے کے لئے نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع، ولی عہد شہزادہ اعظم جاہ اور عمائدین کے علاوہ مولانا شوکت علی اور خواجہ حسن نظامی بھی آئے تھے۔ ڈرامہ کے کردار "مرشد" کا حلیہ بالکل خواجہ حسن نظامی کی طرح تھا۔ حاضرین اور

خواجہ حسن نظامی بھی خوب محظوظ ہوئے۔

۳۔ ا۔ پھول بن:۔

ڈرامہ نگاری کے سلسلہ میں مخدوم کی تیسری اور آخری کوشش پاپن تھی۔ یہ چیخوف کے "چیری آرچرڈ" سے ماخوذ تھا۔ زمرد محل ٹاکیز کے اسٹیج پر پیش کیا گیا مگر ناکام رہا۔

۲۔ ٹیگور اور ان کی شاعری:۔

مخدوم جامعہ عثمانیہ کی طالب علمی کے زمانہ میں اقبال اور ٹیگور سے متاثر رہے۔ جس زمانہ میں "ہوش کے ناخن" اسٹیج ہوا (دسمبر ۱۹۳۴ء) ٹیگور حیدر آباد گئے ہوئے تھے انہوں نے جامعہ عثمانیہ کا دورہ بھی کیا تھا۔ مسز سروجنی نائیڈو نے جو مخدوم کو اپنا بیٹا کہتی تھیں اسی حوالہ سے انہیں ٹیگور سے ملایا تھا۔ انہوں نے ڈرامہ "ہوش کے ناخن" دیکھا اور اس کی تعریف کی تھی۔ مخدوم کو شانتی نکیتن آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ مخدوم نے ان کے سوانحی حالات اور شاعری کے تعارف میں کتاب "ٹیگور اور ان کی شاعری" تصنیف کی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن نے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا کتاب ۱۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا دیباچہ عمومی اور مخدوم کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شامل ہے کتاب کے انتساب میں لکھا ہے۔

> "میں اس حقیر کوشش کو بصد ادب و خلوص اردو کے محسن استادی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ' پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کے نام سے معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔"

مخدوم نے دیباچہ میں امجد حیدر آبادی اور ٹیگور کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا تھا کہ ایک ہی روح دو زبانوں میں ہم سے ہم کلام ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن نے ۱۹۴۳ء میں شائع کیا جس میں ڈاکٹر زور کا دیباچہ عمومی اور "انتساب" شامل نہیں ہیں۔ مخدوم نے اپنا لکھا ہوا دیباچہ بھی تبدیل کردیا ہے۔ نیا دیباچہ عالمی حالات کے تناظر میں انقلابی نوعیت کا ہے۔

ٹیگور کے حالات کو پانچ ادوار میں تقسیم کرکے ۳۲ سرخیوں کے تحت بیان کیا گیا

ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

پہلا دور : ۱۸۶۱ء سے ۱۸۸۴ء تک : ان تحریکات کا ذکر جن کی وجہ سے بنگال میں ادب عالیہ کا احیا ہوا، مغربی تعلیم، راجہ رام موہن رائے اور ٹیگور خاندان کی خدمات اور قابلیت کا ذکر، ٹیگور کس ماحول میں پیدا ہوئے، خارجی اور گھریلو ماحول، ٹیگور کا بچپن، ماں کا انتقال، والد کی تربیت، کن واقعات نے ان کی شخصیت پر اثر ڈالا، تعلیم، مدرسوں سے بے نیازی، فطرت سے عشق، شاعری کی ابتدا، ٹیگور کے بچپن کے رفیق اور ان کا اثر ٹیگور کی زندگی پر، دور اول کی شاعری پر تبصرہ۔

دوسرا دور : ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۱ء تک : شادی اور دوسرے دور کی ابتدا، زندگی میں زبردست تبدیلی، ذمہ داریاں، کار دار کا قیام، سیاسی ڈرامہ، اس پر تنقید، شیلڈا کا قیام، کاشتکاروں سے میل جول، زرعی معاملات اور کاشتکاروں سے ہمدردی، اس دور کے افسانے اور ان پر زرعی ماحول کا اثر، ڈرامے ان پر تنقید، سیاسی اور ادبی سرگرمیاں، مذہبی شاعری کی ابتدا۔

تیسرا دور : ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک : ناول نویسی کی ابتدا، خصوصیات، علیحدگی بنگال کے جھگڑے میں ان کی خدمات، ڈرامہ "ڈاک گھر" اس پر تنقید۔

چوتھا دور : ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک : عالمگیر شہرت، گیتا نجلی، نوبل انعام، ڈرامہ حلقۂ بہار، اس پر تنقید، ٹیگور کی شاعری کے دوسرے رخ، دور شباب کی شاعری پر تبصرہ، گیتا نجلی اور گارڈ نر کا فرق، کریسنٹ مون کا مرتبہ، مشرق بعید کا سفر، جنگ عظیم کا آغاز، قومیت کے خلاف جہاد۔

پانچواں دور : ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۵ء تک : ٹیگور کا پیام ہندوستان اور یورپ کے نام، قومیت کے خلاف خطبات، عالمگیر برادری اور اخوت کی تعلیم، جنگ عظیم اور یورپ، مغرب کا مستقبل، ہندوستان اور تحریک عدم تعاون، اس تحریک کی مخالفت، گاندھی اور ٹیگور کا مقابلہ، شاعر کا تعمیری کارنامہ، شانتی نکیتن اور اس کے حسن کا راز اور مشرقی پہلو۔ خاتمہ

۳۔ سوویت یونین کی بالشویک پارٹی کی تاریخ :

یہ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ مترجمین نور الحسن، عبدالحلیم، ... مئی

الدین اور احتشام حسین ہیں۔ بارہ ابواب اور ۵۸۱ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے کس حصہ کا کس نے ترجمہ کیا ہے اس کا اندازہ ممکن نہیں۔

۴۔ حیدر آباد :

حیدر آباد کے جاگیردارانہ نظام کی مذمت اور اشتراکی خیالات کی تشریح کے لئے یہ کتاب لکھی تھی جو کواپریٹو کیپٹل پریس لاہور میں چھپی اور قومی دارالاشاعت لاہور، بمبئی نے ۱۹۴۷ء میں شائع کی تھی۔ ڈاکٹر داؤد اشرف نے ریاست کے محفوظ امثلہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دین یار جنگ کوتوال نے اپنے مراسلہ مورخہ ۵ خورداد ۱۳۵۶ فصلی مطابق ۵ اپریل ۱۹۴۷ء کے ذریعہ اس پر پابندی عائد کیے جانے کی تحریک کی تھی چنانچہ ۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو نظام سابع نے حکم جاری کیا :

"کوتوال بلدہ نے میرے ملاحظہ میں ایک رسالہ پیش کیا ہے جس کا نام حیدر آباد ہے جس کو مخدوم محی الدین نے طبع کیا ہے۔ اس میں از ابتدا تا انتہا جو مضامین لکھے گئے ہیں وہ کھلے باغیانہ رنگ میں ہیں۔ خصوص اس پر آشوب زمانہ میں ایسے مضامین سے ہر قسم کے فتنے برپا ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا میری دانست میں اس کی خرید و فروخت اندرون ممالک محروسہ سرکار عالی مسدود ہو اور کاپیاں بحق سرکار ضبط ہونے کے قابل ہیں تاکہ اس فتنہ و شرر کا انسداد ہو سکے۔ مجھے امید ہے کہ کونسل کو میری رائے سے اتفاق ہوگا۔ کوتوال بلدہ نے جو رسالہ پیش کیا تھا وہ کونسل کے پڑھنے کے لئے بھیجا جارہا ہے۔"

(بحوالہ حاصل تحقیق از ڈاکٹر سید داؤد اشرف : ص ۱۳۰)

باب حکومت (کابینہ) کے اجلاس منعقدہ ۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو کتاب ضبط کرنے اور اس کی فروخت پر پابندی عائد کرنے کی قرار داد منظور کردی چنانچہ ماڈرن بک ڈپو جہاں سے کتابیں فروخت ہورہی تھیں تمام نسخے ضبط کرلئے گئے۔ اب یہ ناپید ہے۔

۵۔ بگھی کے پیچھے چھوکرا : مرتبہ زاہد علی خاں : سلسلہ مطبوعات اخبار سیاست حیدر آباد دکن : اپریل ۱۹۸۰ء۔

مشمولات :

ایم۔ اے کا مقالہ :

مخدوم نے ایم۔ اے کے امتحان کے لئے مقالہ ''اردو ڈرامہ اور اسٹیج کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ'' لکھا تھا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ یہ فل سکیپ کے ٹائپ شدہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اسے ابواب میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ مرزا ظفر الحسن نے مطالب زیر بحث کی نشاندہی کرنے کے لئے اسے دس ابواب پر یوں تقسیم کیا ہے۔

۷۔ مضامین :

۱۔ گوئٹے کے مکتوبات : مطبوعہ ماہنامہ "مکتبہ" جلد۱، شمارہ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء، حیدر آباد دکن : گوئٹے کے مکتوبات کے حوالہ سے اس کی حیات معاشقہ کا سرسری احوال ہے۔ کیتھن شیان، چارلوٹی لر، فرافان شٹائن، ولپس اس کے جذبہ ہوس کی شکار رہیں آخر الذکر سے اس کے کئی بچے بھی ہوئے اس کے بعد اس سے شادی بھی کرلی۔ باوجود شادی شدہ ہونے کے مینا ہرزلٹ سے تعلقات قائم کئے۔ مضمون کا تعلق مکتوبات سے زیادہ معاشقوں سے ہے :

۲۔ ٹیگور کی شہرت کا راز : مطبوعہ مجلّہ عثمانیہ : جلد ہشتم، شمارہ ۱، ۲ : ۱۹۳۵ء : صفحات ۱ تا ۹ یہ مخدوم کی کتاب "ٹیگور اور ان کی شاعری" کا حصہ ہے۔

۳۔ اردو ڈرامہ کا جدید دور اور حیدر آباد : مطبوعہ مجلّہ عثمانیہ، جلد ۱۰، شمارہ ۱، ۲ : مارچ ۱۹۳۷ء : ص ۸۷ یہ مخدوم کے ایم۔ اے کے مقالے کا حصہ ہے۔

۴۔ مجاہد اقبال : ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو مسلم کلچر سوسائٹی کے زیر اہتمام ٹاؤن ہال حیدر آباد دکن میں یوم اقبال منایا گیا تھا صبح کے اجلاس کی صدارت شہزادہ اعظم جاہ نے کی جس میں مخدوم نے اپنی نظم "اقبال" سنائی اور دوپہر کے اجلاس کی صدارت مہاراجہ سرکشن پرشاد نے کی۔ اس اجلاس میں مخدوم نے اپنا طویل مضمون "مجاہد اقبال" پڑھا۔ رسالہ سب رس، حیدر آباد نے جون ۱۹۳۸ء میں اقبال نمبر شائع کیا اس میں مضمون کا مختصر سا اقتباس شامل کیا گیا۔ مکمل مضمون ناپید ہے۔

۵۔ اندر سبھا سے پہلے : مطبوعہ مجلّہ عثمانیہ جلد ۱۲، شمارہ ۱، ۲ ۱۹۴۰ء صفحات ۳۴ تا ۶۷ یہ بھی مخدوم کے ایم۔ اے کے مقالہ کا حصہ ہے۔

۶۔ ادب کا مقصد اور ترقی پسند ادب : رسالہ سب رس حیدر آباد دکن ۱۹۴۴

۷۔ بگھی کے پیچھے چھوکرا (تحریر ۲۹ جون ۱۹۵۷ء) رسالہ صبا حیدر آباد دکن، اکتوبر نومبر ۱۹۵۷ء ص ۱۸ تا ۲۱

۸۔ چاندنی چوک کا کھڑا مشاعرہ : اخبار سیاست حیدر آباد دکن مخدوم نمبر ۱۹۶۹ء ص ۳۸۴ تا ۳۸۷

۹۔ مشاعرے : رسالہ صبا حیدر آباد دکن ۱۹۵۷ء مئی جون ۱۹۵۸ء ص ۵ تا ۸

۱۰۔ شان نزول : ۱۹۶۷ء میں مخدوم نے جامعہ ملیہ دہلی کے ایک اجتماع میں اپنا منتخب کلام سنایا اور اپنی شاعری کے بارے میں مبض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے بڑی دلچسپ اور دل نشین گفتگو کی۔ اسی گفتگو میں زیادہ تر ایک ہی پہلو سامنے آیا کہ ان کی مختلف نظموں کی شان نزول کیا ہے اور کیا شاعرانہ تخلیق ان کے لئے کسی خاص وقت میں کوئی بالا رادہ عمل ہے یہ گفتگو ٹیپ کرلی گئی تھی جسے من و من تحریر کرلیا گیا۔

مشمولہ مخدوم اور کلام مخدوم : ص ۲۷ تا ۳۲

۷۔ کہانیاں :

پھول اور پتھر (تحریر ۱۹۳۰ء) رسالہ سب رس حیدر آباد دکن : فروری ۱۹۳۹ء ص ۸

کھوئے ہوئی تارے (تحریر ۱۹۳۵ء) رسالہ صبا حیدر آباد دکن مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء ص ۳۵۸، ۳۵۹

پاپن (تحریر ۱۹۳۵ء) رسالہ داستان گو حیدر آباد دکن شمارہ (۱) ۱۹۳۵ء ہفتہ روزہ نقش و نگار حیدر آباد دکن ۸ مئی ۱۹۴۷ء

آدم کی اولاد : (تحریر ۱۹۳۸ء) رسالہ سب رس حیدر آباد دکن ستمبر ۱۹۳۸ء ص ۴۱ تا ۴۴

۸۔ سفرنامہ :

"امن عالم اور دنیا کے مزدوروں کی عالمگیر تحریک کے سلسلہ میں مجھے ۹ مارچ ۱۹۵۳ء سے ۲۹ جولائی ۱۹۵۵ء تک یورپ، ایشیاء اور افریقہ کے کئی ملکوں (کہیں ایک بار اور کہیں ایک سے زائد بار) جانے، رہنے سہنے، لوگوں سے ملنے جلنے اور دوست بنانے کا موقع ملا۔ مجھے آرزو ہی رہ گئی کہ سمندری سفر کروں۔ کوئی ڈیڑھ لاکھ میل کا سفر ہوائی ہی رہا۔ اس سفر کی بے شمار یادیں اب دل کو تڑپاتی ہیں۔ کچھ نقوش تو اتنے گہرے ہیں کہ باوجود مرور زمانہ کے مٹنے کا نام نہیں لیتے۔ جہاں کہیں اور جب کبھی سفر کی داستان چھڑ جاتی ہے تو ہزاروں تصویروں کا ہجوم پوری تفصیل کے ساتھ سامنے کھڑا ہو کر تقاضہ کرتا ہے کہ "ہم بولیں" کوئی کہاں تک روکے؟ اچھا ہے کہ دل کا بوجھ

بالکا ہو جائے۔" مخدوم

مخدوم نے سفرنامے کی کچھ جھلکیاں ان مضامین میں پیش کی ہیں :

۱۔ یورپ کا لکھنؤ، 'ویانا' (تحریر ۲۶ مئی ۱۹۵۷ء)

: رسالہ صبا حیدر آباد دکن : جولائی اگست ۱۹۵۷ء — ص ۷ تا ۱۵

: رسالہ صبا حیدر آباد دکن مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء — ص ۳۶ تا ۳۲۵

۲۔ عید اور خود کشی (تحریر ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء)

: رسالہ صبا حیدر آباد دکن 'اگست ستمبر ۱۹۵۷ء — ص ۷ تا ۱۰

رسالہ صبا حیدر آباد 'مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء — ص ۳۷۲ تا ۳۷۵

۳۔ تحفے (۱) قلم (تحریر ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء)

: اخبار سیاست حیدر آباد دکن' — ۱۹۵۷ :

رسالہ صبا حیدر آباد دکن 'مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء — : ص ۳۷۹ تا ۳۷۹

۴۔ تحفے (۲) اجنبی (تحریر اپریل ۱۹۵۷ء)

: اخبار سیاست حیدر آباد دکن — ۱۹۵۷ء

: رسالہ صبا حیدر آباد دکن مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء — ص ۳۸۰ تا ۳۸۳

۵۔ اپنا کھانا' اپنا گانا

: اخبار سیاست حیدر آباد دکن ۱۹۵۷ : رسالہ صبا حیدر آباد دکن 'مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء

۶۔ راحت جان : اخبار سیاست حیدر آباد دکن،

مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء — ص ۳۶۹ تا ۳۷۱

خطوط

مخدوم کے خطوط جو شائع ہوئے ہیں۔

سبط حسن کے نام : ایک خط

: نیا ادب لکھنؤ دسمبر ۱۹۴۳ — ص ۱۱۵ تا ۱۱۷

: رسالہ صبا حیدر آباد دکن 'مخدوم نمبر ۱۹۶۶ — ص ۳۴۹ تا ۳۰۵

نصرت محی الدین کے نام : چار خطوط

: رسالہ نیا آدم حیدر آباد دکن 'مخدوم نمبر ۱۹۷۰ء — ص ۳۴، ۳۵

کامریڈ محمد مہدی کے نام : دو خطوط

: رسالہ نیا آدم حیدر آباد دکن 'مخدوم نمبر ۱۹۷۰ء ص ۳۵' ۳۷

نصرت محی الدین کے نام : آٹھ خطوط

: مخدوم محی الدین 'حیات اور کارنامے از تمکنت ۱۹۸۶ء

مقدمے۔ دیباچے۔ فلیپ

"پڑھنے والوں سے" مخدوم کے دوسرے مجموعہ کلام "گل تر" کا خود نوشت

مقدمہ : تحریر ۲۴ جولائی ۱۹۶۱ء

پیش لفظ "رخسار سحر" مجموعہ کلام خورشید احمد جامی۔ تحریر ۱۹ دسمبر ۱۹۶۳ء : مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۶۴ء

فلیپ "روشنی کے مینار" جیلانی بانو کے افسانوں کا مجموعہ۔ شائع کردہ نیا ادارہ لاہور

فلیپ "اجلی پرچھائیاں" اقبال متین کے افسانوں کا مجموعہ : مطبوعہ حیدر آباد دکن

رائے "تراشیدہ" شاذ تمکنت کا پہلا مجموعہ کلام : مطبوعہ حیدر آباد دکن : ۱۹۶۶ء

چوتھا باب

شاعری

مخدوم عہد جدید کے شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ غیر روایتی انداز کے شاعر ہیں۔ انھوں نے علم عروض سے باقاعدہ واقفیت حاصل نہیں کی۔ کسی استاد سخن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا حالانکہ جب انھوں نے شاعری کا آغاز کیا حیدر آباد دکن میں باکمال شاعروں کی کمی نہ تھی۔ امجد حیدر آبادی اور نظم طبا طبائی جیسے مسلم الثبوت شاعروں کے علاوہ بے شمار ماہرین فن موجود تھے۔ یہی نہیں، انھوں نے برسوں تخلص بھی اختیار نہیں کیا۔ ابتداء میں نظمیں کہتے رہے جس کے لئے تخلص کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی ۱۹۵۸ء کے بعد جب غزلیں کہنے لگے تو اپنے نام ہی کو تخلص قرار دے دیا۔ یہ تخلص بھی صرف تین غزلوں اور ایک واسوخت میں ہے۔ غزلوں کے مقطعے ہیں۔

شہر میں دھوم ہے اک شعلہ نوا کی مخدوم
تذکرے رستوں میں، چرچے ہیں پری خانوں میں

یہ مہکتی ہوئی غزل مخدوم
جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

شکست و ریخت زمانہ کی خوب ہے مخدوم
خودی تو ٹوٹی تھی، خوئے بتاں بھی ٹوٹی ہے۔

اور، واسوخت میں کہا ہے:-

اس جنوں کو ذرا دھوپ سے روکو مخدوم
چھوڑ کر چھاؤں گل تر کی کہاں جانے لگا

مزاج کے اعتبار سے وہ اس حد تک لا ابالی تھے کہ کبھی اپنا کلام رسائل میں شائع

کروانے کا اہتمام نہیں کیا۔ ممکن ہے ابتدا میں یہ رویہ اس لئے رہا ہو کہ اصلاح کے بغیر ان میں اعتماد نہ پیدا ہوا ہو۔ ان کی بے نیازی کی وجہ سے ان کی نظمیں ضائع بھی ہوئیں۔ ان میں ایک "بچے" تھی۔ جو نہ کاغذ پر محفوظ رہی نہ ان کے ذہن میں۔ ان کی پہلی نظم مجنوں گورکھپوری کے رسالہ "ایوان" میں شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی ان کے ایک دوست نے انھیں بتائے بغیر روانہ کردی تھی۔

مخدوم کی شاعری کی ابتداء ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ ہوئی جب وہ جامعہ عثمانیہ میں بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ اپنے اسکول کے زمانہ میں مطالعہ کے شوق کی بناء پر وہ اردو اور فارسی کے استادوں کے کلام سے روشناس ہوچکے تھے۔ اس دوران وہ جن شاعروں سے متاثر ہوئے وہی ان کے معنوی استاد کہلائے جاسکتے ہیں۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا تھا کہ :

"مجھے امیر مینائی کی غزلیں اور عظمت اللہ خاں کی نظمیں بہت پسند تھیں اور میں میر اور غالب سے بھی متاثر تھا۔ اس دور کے شعراء، اقبال، فانی اور اصغر سے اور پھر حفیظ کے گیتوں، جوش اور اختر شیرانی کی نظموں سے"

(رسالہ صبا، حیدر آباد دکن : مخدوم نمبر : ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۷۸)

موخرالذکر تینوں شاعروں کے نمایاں اثرات ان کے ابتدائی کلام میں موجود ہیں۔ انھوں نے حسرت موہانی کا ذکر نہیں کیا جب کہ رومانی نظموں کی فضا جہاں اختر شیرانی کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ وہیں محبوب کے ارضی ہونے کا ویسا ہی احساس ملتا ہے جیسا کہ حسرت کے کلام میں ہے۔ وہی نسوانی پیکر، ویسے ہی ناز و انداز، روٹھنے کی وہی کیفیت! شاعری سے قطع نظر بھی مخدوم اور حسرت میں طبائع کی یکسانیت تھی۔ دونوں شاعری میں رومان پرور اور عملی زندگی میں انقلابی تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مخدوم نے اپنے پہلے مجموعہ کلام "سرخ سویرا" کو "محبت اور محنت" سے معنون کیا ہے جب کہ حسرت پہلے ہی کہہ چکے تھے۔

گرفتار محبت ہوں، اسیر دام محنت ہوں
میں رسوائے جہان آرزو یعنی حسرت ہوں

مخدوم ایک فطری شاعر تھے۔ ان کا فن اکتسابی نہیں وجدانی تھا۔ قدرت نے ہر حساس انسان میں تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں جو ارادے اور خواہش کے بغیر کار فرما ہوتی ہیں۔ تخلیقی عمل اس قدر خود ارادی کے بغیر ہوتا ہے کہ ان لمحوں میں وہ اپنے آپ کو اجنبی سا محسوس کرتا ہے اور خوشگوار استعجاب کے ساتھ اس صلاحیت کا پابند ہو کر سرور و انبساط کی ایسی دنیا میں کھو جاتا ہے جس کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس عالم بے اختیاری میں تخلیقی عمل تکمیل کو پہنچتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تخلیقی صلاحیت ہمیشہ جاگتی رہے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شاعر تخلیقی عمل شعوری طور پر سمت اور جہت متعین کر کے انجام دے۔ ایسا بھی ہوتا ہے لیکن اسے تخلیقی عمل نہیں صناعی کہا جائے گا اور صناعی کے جوہر دکھانے والے شاعروں کی کمی نہیں ہے۔

اس نظریہ کی تائید مخدوم کی اس بات چیت سے ہوتی ہے جو ۱۹۶۷ء میں جامعہ ملیہ دہلی کے ایک اجتماع میں کی تھی انھوں نے بتایا تھا کہ :

"شان نزول کی اس کو (شاعر کو) خبر نہیں ہوتی۔ خاص طور پر غزل میں، نظموں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ دونوں ہی بے ارادہ ہوتی ہیں۔"

"میرا تجربہ تو یہ ہے کہ نظم ایسے وقت میں ہوتی ہے جب دماغ میں بالکل ایک قسم کی خاموشی ہو، بالکل خاموشی -- ذہن میں بھی -- اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ غیر محسوس سی ایک بے چینی ضرور ہوتی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے پھر کچھ مصرعے یا کچھ لفظوں کی ترکیبیں آنا شروع ہوتی ہیں اور پھر اس میں میٹر (بحر) بھی نکل آتی ہے --- پھر سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔"

"یہ سوال کہ نظم کیسے ہوتی ہے؟ تو میرا تجربہ یہ ہے کہ اس کو اسی وقت کا جو ماحول ہے اس سے یا کسی اہتمام یا ارادے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے پوری بے تابی کے ساتھ اپنا تجربہ آپ کے سامنے رکھا ہے۔"

"جو چھوٹی چھوٹی تاثراتی نظمیں ہوتی ہیں، ارادہ سے ان کا کوئی

تعلق نہیں ہوتا۔ کب کب کے لفظ، کیفیتیں اور تاثرات ہوتے ہیں
جو سمٹ کر ایک ہی وقت میں چلے آتے ہیں اور تخلیق ہوتی ہے۔"

شعر کہنے پر طبیعت کسی وقت بھی مائل ہو سکتی ہے۔ انتہائی غیر شاعرانہ ماحول میں بھی شعری تخلیقات کی صلاحیت جاگ اٹھتی ہے۔ مخدوم نے اسی گفتگو میں اپنا تجربہ بیان کیا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کی میٹنگوں کے دوران جب کہ انتہائی سنجیدہ، اور گمبھیر مسائل پر غور و خوض ہو رہا ہے ان کی فطرت کی امنگ نے شعر گوئی پر مجبور کیا اور انھوں نے ماحول سے بیگانہ ہو کر نظمیں کہیں "لومبا" اور "بھاگ متی" ایسی ہی میٹنگوں کے دوران لکھی گئی تھیں۔ "چاند تاروں کا بن" جیسی کامیاب نظم ریل کے سفر کے دوران نازل ہوئی۔ اس نظم کے بارے میں انھوں بتایا کہ

"دماغ میں کچھ گونج سی ہونے لگی۔ ایک تو ٹرین کی رفتار جو ہوتی ہے وہ Rythem دیتی ہے اور خیالات، ایسے ہی بکھرے بکھرے، پریشان سے خیالات آنے شروع ہوئے۔ بالکل بے معنی ہے، بہت سے مصرعے ایسے تھے کہ بے معنی تھے لیکن اس میں سے یہ نظم بنتی چلی گئی بنتی چلی گئی، اور پھر وہ نظم ہو گئی۔"

نظم "قمر" کے بارے میں بتلایا ہے کہ

"کچھ احباب تاش کھیلنے بیٹھے۔ وہاں ایک دم مجھے خیال آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہئے، میں وہ سب چھوڑ کر چلا گیا۔ تنہائی کے لئے کہیں جگہ نہ ملی تو قریب ہی ایک طویلہ تھا وہاں پہنچ گیا۔ طویلے میں میں نے ایک نظم لکھی "قمر"۔۔۔۔ طویلے میں جہاں گندگی تھی، بدبو تھی، مچھر تھے، جی ہاں! وہاں "قمر" جیسی نظم ہوئی۔ تو بات یہ ہے کہ میرے سامنے تخلیق کا عمل اتنا "پر اسرار" ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ خیال آجاتے ہیں۔ الفاظ چلے آتے ہیں اور شعر بنتے چلے جاتے ہیں۔"

یہ ہے فطری شاعری کا تخلیقی عمل! ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ اس کی مثال بھی مخدوم ہی ہیں۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ تک وہ کوئی شعر نہیں

کہہ سکے۔ ایک سکوت کا عالم طاری رہا۔ ۱۹۵۱ء میں جب وہ سنٹرل جیل حیدر آباد (دکن) میں تھے تو نظم "قید" سے یہ سکوت ٹوٹا۔ اس نظم کی شان نزول کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ

"قید نظم بھی کچھ ایسے انداز میں ہوئی۔ یہ نظم جیل میں ہوئی تھی۔ بہت دنوں سے ہم نے کوئی نظم نہیں کہی تھی۔ وہاں جیل میں مختلف زبانوں کے لوگ تھے۔ جیل میں کچھ کام نہیں ہوتا تو باغبانی کرتے ہیں، شاعری کرتے ہیں۔ کچھ کارنر (گوشے) بن گئے تھے۔ ڈرامہ کارنر، فلاں کارنر، فلاں کارنر، تو ہم پوئٹری کارنر میں تھے۔ پوئٹری کارنر میں تو رہے لیکن شعر ہی نہیں لکھے گئے ایک وقت ہمیں علاحدہ علاحدہ سیل (چھوٹی تاریک کوٹھری) میں بند کردیا گیا۔ مجھے جیسے ہی اس کوٹھری میں بند کیا گیا ایسا معلوم ہوا کہ دماغ کا دروازہ کھل گیا ہے۔ جی ہاں! دو تین منٹ میں میں نے نظم لکھ دی۔"

اسی نوع کے خیالات کا اظہار انھوں نے "گل تر" کے دیباچہ میں کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں لکھنے پر مجبور کیا جارہا ہوں۔ سماجی تقاضے پر اسرار طریقے پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔ زندگی ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کچھ لکھا ہی نہیں"

(مخدوم : پڑھنے والوں سے : مشمولہ گل تر : صفحہ ۶)

اس نامعلوم تخلیقی صلاحیت کی وضاحت انھوں نے یوں کی ہے۔

"شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات یکجا ہو کر تسکین و طمانیت کے کرب میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ شاعر بہ حیثیت ایک فرد معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے، روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا

ہے۔ شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوع انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔" (گل تر' صفحہ ۵)

ان اقتباسات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ شعر کہنا مخدوم کے لئے ایک داخلی عمل ہے جسے خارجی شاعری کہا جاتا ہے وہ بھی شاعر کے لاشعور کی گہرائیوں سے از خود بر آمد ہوتی ہے۔ یہ شان اور کیفیت فطری اور وجدانی شاعر ہی میں ملے گی۔ اس کے برخلاف جو شاعر شعر گوئی فرماتے ہیں وہ شاعری نہیں کرتے صرف صنعت گری کرتے ہیں۔ ایسے فطری شاعر سے مطالبہ کرنا کہ وہ کیا لکھے اور کیا نہ لکھے اس کی تخلیقی صلاحیت پر جبر کے مترادف ہے۔

مخدوم کی شاعری رومان پرور رہی ہے۔ یہی حال فیض کی شاعری کا ہے۔ یہاں ایک غیر متعلق سی بات کا اظہار بھی کردوں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں' سال کے تفاوت کے باوجود ایک ہی ماہ میں پیدا ہوئے۔ مخدوم کی تاریخ پیدائش ۴ فروری ۱۹۰۸ء اور فیض کی ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء۔ دونوں کا ستارہ زحل اور برج دلو ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ستارہ اور برج کے زیر اثر رہنے والے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ ان کے دل محبت کے جذبہ سے معمور ہوتے ہیں۔ وہ صرف محبت کرتے اور کئے جانے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی سوچ میں رومانیت ہوتی ہے اور دل کو رغبت فنون لطیفہ سے رہتی ہے۔ اسی لئے مخدوم اور فیض کے کلام میں غالب کیفیت رومانی ہے۔ ان دونوں کے کلام میں بے چینی کا احساس ہے لیکن وہ گھن گرج' بلند آہنگی اور نعرہ بازی نہیں کہ ترقی پسند انھیں "انقلابی" ہونے کی سند دیتے۔ اسی لئے سردار جعفری نے مخدوم پر اعتراض کیا تھا کہ

> مخدوم یہ تو صرف تمھاری خواہش ہے کہ سویرا ہوجائے۔ ورنہ ابھی تو کہیں سویرے کے آثار نہیں ہیں۔ تمھاری نظموں میں درد ہے' دکھ ہے' تکلیف کا احساس ہے لیکن وہ اعتماد' اور حوصلہ نہیں' وہ آن بان اور جوش و خروش نہیں جو انقلابی شاعری کی شان ہے۔"
>
> (سردار جعفری : نئے ادب کے معمار' مخدوم محی الدین : کتب پبلشرز لیمٹڈ بمبئی ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۳)

سردار جعفری کا بیان ہے کہ اس اعتراض پر مخدوم نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تھا۔ یہ بے بسی ان کی نہیں اس نامعلوم تخلیقی صلاحیت کی تھی جو ان سے شعر لکھواتی تھی۔ انھوں نے خارجی مطالبہ کے آگے فن کو رسوا نہیں کیا۔ جو کچھ کہا اپنے احساس، تاثر، ضمیر، فکر اور ذات کے تقاضوں کے تحت کہا۔ اسی لئے ان کے کلام میں معنوی وسعت ہے۔ مخدوم کی شاعری کا پہلا دور (سرخ سویرا کا دور) وہی ہے جو ترقی پسند شاعری کے "مقبول عوام" ہونے کا دور ہے۔ اس دور میں شاعری تجربات کی بھول بھلیوں سے گزری۔ ان میں ذہنی اور فنی تجربات شامل تھے۔ نوجوان ذہن متاثر ہوئے۔ ان کا کاروان تحریک کے جلو میں رواں دواں رہا۔ مخدوم اس کاروان میں شامل تھے لیکن اپنے انداز کی بنا پر سب سے الگ تھلگ رہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے۔

"انقلابی شاعروں" کے رویے کے بارے میں سبط حسن نے لکھا ہے کہ

"مجھے اکثر نوجوان شاعروں سے یہ شکایت ہے کہ وہ محبت کا عجیب و غریب معیار قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں اس انقلابی دور میں "ہمارے لئے" یعنی مردوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ عورتوں کی محبت کے خیال میں پھنسیں۔ یہ عمل کا وقت ہے۔ ہاں انقلاب برپا کرنے کے بعد جب فرصت ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ اس لئے بعض شاعر اپنی محبوبہ دلنواز کو بڑے پندار اور پدرانہ شفقت سے نصیحت کرتے ہیں کہ تم گھر لوٹ جاؤ کیونکہ تم میں مجھ جیسے انقلابی کے پہلو بہ پہلو چلنے کی طاقت نہیں ہے البتہ جب مجھے انقلاب سے فرصت ملے گی تو میں آجاؤں گا بیچارے بر خود غلط شاعر!"

(سبط حسن : مخدوم کے نام خط مشمولہ سرخ سویرا :)

اسی تناظر میں فیض نے کہا تھا۔

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

مجاز ایک قدم آگے بڑھے اور "حقیقت پسندی" کا ثبوت انھوں نے اس طرح دیا کہ

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

جب کہ مخدوم یار اور دار کو ساتھ لئے چلنے کے قائل تھے۔ ان کے فطری جذبے نے انھیں کہنے پر مجبور کیا :

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو سات لے کے چلو

وہ فرض اور فطرت کے درمیان مصنوعی دیوار کھڑی کرنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ انقلابی عمل کے دوران بھی محسوس کرتے تھے کہ

ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں ان کی جوانی ساتھ ہے

اور کبھی ان کی فطرت یہ کہنے پر مجبور کردیتی کہ

اے حسن کے تاجدار آیا آیا
اے یار غمگسار آیا آیا
او "کار جہاں" دور ہو للہ نہ چھیڑ
ہاں ہم سفر بہار آیا آیا

زندگی کے بارے میں ان کا رویہ ہمیشہ حقیقت پسندانہ رہا۔ شاعری کی خاطر اور وقتی مصلحتوں کی بناء پر اسے کبھی تبدیل نہیں کیا۔ اس کا اظہار زیادہ واضح طور پر ان کی نظم "آج کی رات نہ جا" میں ہوا ہے :

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے

زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے

زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
(آج کی رات نہ جا : گل تر، صفحہ ۱۸۷)

وہ تو بڑی سے بڑی آزمائش کی گھڑی بھی خوش دلی سے برداشت کرنے کو تیار

ہیں۔ بشرطیکہ

دل بڑھاتی رہیں ہاتھ کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے
(پیار کی چاندنی : گل تر، صفحہ ۴۵)

ترقی پسندی کا ایک اور عجیب و غریب تصور سردار جعفری نے پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ہمارے دل میں یہ امنگ تھی کہ ان جمہوری ادیبوں کی طرح ظلم، جہالت، شہنشاہیت، اور بربریت کے خلاف لڑ کر ہم بھی کہیں اپنی جان دے دیں۔ اس خیال میں "رومانیت" زیادہ تھی۔ جان دینے کے مواقع تو ملے نہیں اور اگر کہیں تھے تو ہم ان تک نہیں پہنچ سکے۔ اس لئے ہم اپنے نچلے درمیانی طبقے کی تمام قدروں کو پیروں تلے روند کر انتقام لے رہے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہی سچی ترقی پسندی ہے اور یہی لاابالی پن کا راز ہے۔"

(سردار جعفری : نئے ادب کے معمار، مخدوم محی الدین : کتب پبلشرز بمبئی ۱۹۴۸ء صفحہ ۱۵)

اس "انوکھی ترقی پسندی" میں سردار جعفری، مخدوم کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے جس کے پاس ظلم، جہالت، شہنشاہیت اور بربریت کے خلاف لڑنے کا "رومانیت" سے معمور تصور نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی عمل تھا۔ انھوں نے جان دینے کے مواقع نہ ملنے کا عذر نہیں کیا بلکہ اس کے مواقع پیدا کئے اور سرخ رو ہو کر نکلے۔ ان کا تعلق معاشرے کے سب سے مظلوم "درمیانی" طبقے سے تھا۔ انھوں نے اس حیثیت کو Own کیا۔ اس سے کبھی اپنا رشتہ نہیں توڑا اور نہ اس کی قدروں کو پیروں تلے روند کر اپنے طبقے اور اپنے آپ سے انتقام لیا۔ وہ لا ابالی ضرور تھے ساتھ ہی فکری اور عملی اعتبار سے ترقی پسند اور انقلابی بھی تھے۔

شاعری میں مخدوم کا رجحان معاصرین سے مختلف ہے۔ ان کی آواز منفرد ہے۔ ان کا نکتہ نظر جداگانہ، جرات مندانہ اور صحت مند ہے۔ وہ روح کی گہرائی سے بلند ہونے

والی آواز کو شاعری مانتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے "مسائیوں کی شاعری" کی ہی نہیں! کی ہے مگر برائے نام!! ایسی نظمیں ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتیں۔ یہ حالات اور "تحریک" کے جبر اور "ترقی پسند شاعری کے امام" کی تقلید کا نتیجہ ہیں۔ اسی لئے بے رنگ اور بے کیف ہیں۔ موت کا گیت' مستقبل' آزادی' وطن' اور مشرق' سطحیت اور نعرہ بازی کی مظہر ہیں۔ ٹوٹے ہوئے تارے' اندھیرا' زلف چلیپا' آتش کدہ اور حویلی بڑی خوبصورت خیال آفریں' پر اثر نظمیں ہیں۔ ان میں خیال اور اسلوب کا انوکھا پن اور تنوع ہے لیکن زلف چلیپا کے آخری شعر :

عزم آزادی سلامت' زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو' بغاوت زندہ باد

اور حویلی کے آخری شعر

آ انہیں کھنڈروں پر آزادی کا پرچم کھول دیں
آ انہیں کھنڈروں پر آزادی کا پرچم کھول دیں

نے ان نظموں کے مجموعی تاثر کو گھٹا دیا ہے۔ ان کے برعکس "اندھیرا" کا آخری شعر نظم کے مرکزی خیال کو ابھارتا ہے :

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

مخدوم کی شاعری کے حوالے سے احتشام حسین کے اس خیال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ

"مخدوم کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کا علم ہونا ضروری ہے کہ وہ مارکسی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ عملی سیاست میں کمیونزم کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کی اشاعت اور تبلیغ سے کبھی غافل نہیں ہیں۔ اس کی صداقت اور حق پسندی پر ان کا اس طرح ایمان ہے کہ وہ اس سے انحراف کو گمراہی سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سوچنا بالکل عبث ہوگا کہ ان کی شاعری کی پرکھ میں ان حقائق

کو نظرانداز کردیا جائے کہ اس نظریہ سے وابستگی نے ان کی تخلیقات
کو قوت بخشی یا نقصان پہنچایا۔"

بلاشبہ نظریہ پر استقامت نے ان کی تخلیقات کو قوت بخشی ہے لیکن "تحریک" کے رویہ نے اسے نقصان بھی پہنچایا ہے اس فرق اور حقیقت تک نظریں کم ہی گئی ہیں۔ جہاں انھوں نے "جبر" کے بجائے اپنے وجدان سے شعر کہے ہیں اس کی گہرائی اور گیرائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی سیاسی نوعیت کی نظموں میں دوسرے دور کی نظم "چاند تاروں کا بن" سب سے کامیاب ہے۔ اسے جدید اردو شاعری کا شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ تاریخی حقیقت کو احساس کی گرفت میں لے کر ماضی، حال اور مستقبل کی نشاندہی پوری فن کاری سے کی ہے۔ اس میں کھوکھلے نعروں سے کام نہیں لیا ہے۔ نظم کا لہجہ "انقلابی" "پرجوش" نہیں ہے۔ رمزیاتی زبان استعمال کرکے معنویت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ان کی نظر میں ماضی

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لئے
منتظر مرد و زن
اور لمحہ آزادی ـــ گویا
کچھ اماماں صد مکروفن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمین گاہ سے
پھینک کر اپنی زباں
خون نور نگل گئے

اس صورت حال سے شاعر مطمئن نہیں ہے اور مایوس بھی نہیں۔ بد ترین حالات میں رجائیت اسے سہارا دیتی ہے اور نئے عزم وہمت کے ساتھ وہ گویا ہوتا ہے۔

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہم دمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

رمزیت کی گہرائی اور وسعت نے تین ادوار کی عکاسی کر دی ہے۔لفظ لفظ پہلو دار اور معنوں کا سمندر ہے۔ انداز بیاں میں کوئی تلخی نہیں۔ لہجہ کی نرمی نے تاثیر میں جو اضافہ کیا ہے وہ بلند آہنگی اور نعرہ بازی سے پیدا نہ ہو سکتی تھی۔

اسی طرح جنگ سے نفرت پیدا کرنے کے لئے انہوں نے نظم "سپاہی" لکھی۔ یہ بھی ان کے مزاج کے مطابق ہے اور موثر ہے۔ خصوصاً اس کے دونوں ابتدائی بند جنگ کے خلاف نفسیاتی حربے ہیں۔ "سپاہی" کا اس ماحول کے حوالہ سے ذکر ہے جو اس کی حقیقی زندگی ہے۔ اس میں بات سپاہی کے بارے میں کم، اس کے حوالہ سے زیادہ کہی گئی ہے۔ یہی اس نظم کا انوکھا پن ہے۔ ان دو بندوں میں کرب اور اضطراب کی ایک دنیا دیکھی جا سکتی ہے۔

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے　　بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آ رہی ہے　　زندگی ہے کہ چلا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو　　وہ کہاں جا رہا ہے

کیسا ڈر ڈر کے چلتے ہیں تارے
کتنے سہمے ہوئے نظارے
سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے
کیا جوانی کا خوں ہو رہا ہے؟
کہاں جا رہا ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ

ان نظموں سے واضح ہو جاتا ہے کہ نظریات اور معتقدات، زندگی کے مصائب اور مسائل کو شعر کے ذریعہ پیش کرنا شاعر کا فرض ہے۔ جس طرح عملی زندگی میں وہ ان کا حصہ ہوتے ہیں اسی طرح شاعرانہ شعور میں بھی رچے بسے رہتے ہیں۔ نہ زندگی میں ان سے فرار ممکن ہے اور نہ شاعری میں ان سے نجات ضروری ہے۔ بات صرف سلیقے کی ہے۔ اردو زبان کی وسعتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا ہر لفظ پہلو دار ہے۔ اس میں رمزیت کے جو امکانات ہیں ان سے فائدہ اٹھاکر کم سے کم الفاظ میں بڑے سے بڑے مطالب ادا کئے جاسکتے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ جدت کے شوق میں سطحیت اور نعرہ بازی کو شعار بنایا جائے۔ ادب کے ذریعے پروپگنڈہ بھی ہوتا ہے۔ نظریات کا، معتقدات کا، خیالات کا، لائحہ عمل کا، اس کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں۔ ادبی پروپگنڈہ اور اخباری اشتہار میں بہرحال فرق ہونا چاہئے۔ مخدوم کی چند نظموں میں جزوی طور پر سطحیت کا مظاہرہ ہے لیکن زیادہ تر نظمیں ان کے معتقدات اور خیالات کی ترجمان ہونے کے باوجود شدت احساس اور نرمئ گفتار کی وجہ سے بہت بلند درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی جو ان سے متفق نہیں ہیں، ان کی فن کاری کے قائل ہیں۔

ان کی نظموں میں انفرادی شان ہے۔ مخدوم نے محبت کے تصور کو تخیل کی ابہمیت سے نکال کر اسے ارضیت عطا کی ہے۔ یہ رویہ اس دور میں خال خال تھا عام نہ ہوا تھا اسے عام کرنے میں اختر شیرانی، حسرت موہانی کے بعد سب سے بڑا ہاتھ مخدوم کا ہے۔ انھوں نے شاعری کی روش کو یکسر بدل دیا۔ ناکامی، نامرادی اور ان کے نتیجے میں آہ وفغاں اردو شاعری کی پرانی روایت ہے۔ مخدوم کے کلام میں ان کا ذرا سا بھی اثر نہیں۔ وہ رجائیت اور سرخوشی کے شاعر ہیں۔ انبساط، آسودگی، کامرانی سے ان کے اشعار نئے رویئے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو'' کے فلسفہ کے قائل ہیں جہاں کہیں ہلکا سا احساس محرومی یا کرب انتظار ہے وہ بھی ایک

"لمحہ گزراں" سے زیادہ کی کیفیت نہیں رکھتا۔

مخدوم مزاج کے اعتبار سے رومان پسند ہیں۔ "سرخ سویرا" کی رومانی نظمیں ان کی خام جوانی کے تجربوں کی عکاس ہیں۔ اشعار سے اندازہ ہوتا ہے انھوں نے کسی کو چاہا ہے اور وہ چاہے گئے ہیں۔ یہ تجربے آزمائش کی منزلوں سے نہیں گزرے ہیں۔ ان نظموں میں شدت احساس کی کمی ہے اس کی جگہ معصومانہ بانکپن، والہانہ نشاط انگیزی اور فطری سچائی جیسے عناصر موجود ہیں۔ یہ نظمیں دلوں میں اترتی نہیں دلوں کو لبھاتی ہیں۔ ان کی تاثیر خمار نیم شبی ہے شب دوشینہ کی سرمستیاں نہیں۔ باتوں میں گہرائی نہیں، سچائی ہے اور ہر سچائی حسین ہوتی ہے۔ اس دور کی ایک نظم "طور" جس کے دل لبھانے کی صفت کا اقرار سبط حسن نے یوں کیا ہے

"نظم طور کے عنوان سے ایوان مرحوم میں اس سے پہلے چھپ چکی تھی اور مجاز نے اور میں نے اسے یادش بخیر علی گڑھ میں کئی بار لذت لے لے کر پڑھا۔" ("سرخ سویرا" : صفحہ ۱)

اس نظم کے ہر بند میں معصومانہ بانکپن اور والہانہ نشاط کی کیفیات ہیں۔

دلوں میں اژدھام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرادیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جام شراب آتا
وہ کیا آتا رنگیلی راگنی رنگین رباب آتا
مجھے رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب آتا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مست شباب آتا
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بہے جاتے تھے بیٹھے عشق کے زریں سفینے میں
تمناؤں کا طوفاں کروٹیں لیتا تھا سینے میں

جو چھو لیتا میں اس کو وہ نہا جاتا پسینے میں
مئے دو آتشہ کے سے مزے آتے تھے جینے میں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکر فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرور سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

نظم "جوانی" میں نوخیز حسن کو محاکاتی دل آویزی کے ساتھ یوں پیش کیا ہے کہ اس کی مکمل تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

بھرنے لگے بازو تو ہوئے بند قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

ساغر کی کھنک بن گئی اس شوخ کی آواز
بربط کو ہوئی گدگدی یا جاگ اٹھے ساز

اعضا میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارہ ہے تو بجلی ہے نظر میں

آنے لگی ہر بات پہ اک اک کے ہنسی اب
رنگین تموج سے گراں بار ہوئے لب

(سرخ سویرا : صفحہ ۲۷، ۲۸)

اس میں کیفیات حسن ہیں اسی کے ساتھ شاعر کی قوت مشاہدہ اور انھیں شعر کی گرفت میں لے لینے کی صلاحیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ نظم خیال سے زیادہ اظہار کا کرشمہ ہے۔ ایسی ہی اعلیٰ درجہ کی کرشمہ سازی "وہ" میں ملتی ہے جو سرخ سویرا کی بہت اچھی نظموں میں سے ایک اور مقبولیت کے اعتبار سے سب سے بڑھی ہوئی

وہ خم گردن، وہ دست ناز، وہ ان کا سلام
ابروؤں کا وہ تکلم، وہ نگاہوں کا پیام

بولتی آنکھوں کا رس گلرنگ عارض کا جمال
مسکراتا سا تصور گنگناتا سا خیال

اور کیا ہوگی کسی کی کائنات سال و سن
عشق کی دو چار راتیں حسن کے دو چار دن

محاکاتی حسن اور اظہار کی کرشمہ سازی کے حوالے سے "ساگر کے کنارے" بھی دل لبھانے والی نظم ہے۔

انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی
ملتا ہوا آنکھیں اٹھا فتنوں کو جگائے

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لئے سر پر چلیں پانی کے بہانے

انگشتری حسن کے انمول نگینے
سرچشمہ محبت کے، مسرت کے خزانے

چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

چہروں کو کبھی شرم سے آنچل میں چھپانا
گہہ کھیلنا پانی سے وہ جھینپ اپنی مٹانے

تالاب پہ افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

"سرخ سویرا" کی نظموں میں بھی انفرادی شان ہے۔ مخدوم نے محبت کو تخیل کی لاحنیت سے نکال کر اسے ارضیت عطا کی ہے۔ یہ رویہ آج عام ہے اسے عام کرنے

میں مخدوم کا بڑا ہاتھ ہے۔ نظموں میں جس محبوب کا ذکر ہے وہ ابھی کمسن ہے۔ جب وہ کہتے ہیں۔

بیدار ہوئیں مہر جوانی کی شعاعیں
پڑنے لگیں عالم کی اسی سمت نگاہیں
(جوانی)

کھیلتا تھا جب لڑکپن سے ترا رنگین شباب
ہٹ رہی تھی ماہ عالم تاب کے رخ سے نقاب
(یاد ہے)

معصوم لڑکپن کے رخ پر
نوخیز جوانی کا غازہ
(نورس)

کتنی نو آغاز کلیاں کتنے خوشبودار پھول
میری ٹھنڈی سانس پر ہوتے ہیں رنجور و ملول
(آتش کدہ)

تو ان کے ذریعہ خود اپنی نوجوانی کی بھی غمازی کرتے ہیں' اس سن و سال کے لحاظ سے جو لفظی پیکر سامنے آتے ہیں وہ معصومیت اور بھولپن لئے ہوئے ہیں۔ ان میں وہ عشوہ و ناز و ادا' اور چال بازی' ستانے' تڑپانے کی کوئی کیفیت نہیں جس سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ ایک خصوصیت نظموں کی نشاط انگیز فضا ہے۔ ملاقاتوں کی وہ کیفیات ہیں کہ کبھی "نظر سے گفتگو ہوتی تھی" "لبوں کی مئے پلائے جاتی تھی" "جو چھو لیتا میں اس کو وہ نما جاتا پسینے میں" "نئی دلہن کی تھرتھری بن کر" "کچھ سننے کی خواہش کانوں کو' کچھ کہنے کا ارمان آنکھوں میں"۔۔۔

ان میں معصومانہ کیف ہے' حسن پرستی ہے' جنسی رغبت یا بے اعتدالی نہیں ہے۔ تہذیبی شعور ہے جو شاعر کے مزاج میں رچا بسا تھا۔ ان کا محبوب بھی کوئی "ارزاں شئے" نہیں "دختر یا کنیزگی" اور "نا آشنائے سیم و زر" ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے محبوب کے تصور کو یکسر بدل دیا ہے۔

اسی طرح "انتظار" یا "عالم ہجر" میں نہ آہوں کا دھواں ہے اور فغاں کے شعلے۔ ان میں بھی ایک ضبط ہے جو احساس خلش سے آگے نہیں بڑھتا۔ یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر اس جدائی کو عارضی سمجھتا ہے۔ اسے اپنی محبت پر اعتبار ہے۔ اس ساری روداد حسن و عشق میں شاعر کا اپنا کردار بھی ہے۔ ہر بات ذات کے حوالے سے ہے۔ مخدوم نے سرخ سویرا اور گل تر کی شاعری میں "فرق" کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا کہ ۔۔۔

"شاید یہ خیال بھی آئے گا کہ کلام کا یہ مجموعہ (گل تر) اپنی سج دھج، نفس مضمون، حقیقت، ندرت، جمالیاتی کیف و کمیت اور تاثر کے اعتبار سے "سرخ سویرا" سے مختلف ہے۔ (بساط رقص : صفحہ ۱۷)

اس کی وضاحت بھی کی ہے کہ

"یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ، اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقاء کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر بھی انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر قدر مشترک ہیں۔" (بساط رقص : صفحہ ۱۹)

مخدوم نے فرق کی بات کی ہے، شاذ تمکنت اسے ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں۔

"گل تر اپنی کیفیت اور اسلوب کے اعتبار سے سرخ سویرا سے یکسر مختلف ہے ارتقاء اور آہنگ شعر کی ایسی مثالیں فیض کے علاوہ شائد ہی کہیں ملے جس طرح فیض نقش فریادی کے بعد چپ رہے اور جب دم لے کر آگے بڑھے تو دست صبا کا تحفہ پیش کیا جو نئے آب و رنگ کا نمونہ ہے۔ سرخ سویرا اور گل تر کے رنگ سخن اور اسلوب بیان میں فیض کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی ارتقاء پذیری ملتی ہے۔" (شاذ تمکنت : مخدوم محی الدین، حیات اور کارنامے : مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۰۹)

گل تر اور اس کے بعد کے کلام میں ارتقاء ہی نہیں تکمیل ارتقاء ہے۔ مخدوم احساس کی گہرائی اور شدت کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب ہوئے۔ اس دور میں ان کا نقطہ نظر یکسر بدلا ہوا ہے۔ سرخ سویرا میں "وہ کردار" تھے تو بعد کے دور میں مبصر اور محتسب بھی بن گئے ہیں۔ اب ذات کے بارے میں کم' ذات کے حوالے سے عالم انسانیت کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ مسائلی نظموں میں سطحیت اور نعروں کی جگہ گہری سوچ کا غلبہ اس کی نمایاں مثالیں "چاند تاروں کا بن" اور "چارہ گر" ہیں۔

"چارہ گر" موضوع' ڈکشن اور خیال کے اعتبار سے منفرد نظم ہے۔ محبت کرنے والوں کا آفاقی اور ابدی المیہ اظہار کی کرشمہ سازی سے اس انتہا کو پہنچا ہوا ہے جو دل اور ذہن دونوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ فکر اور احساس کی اس دنیا تک اسی انداز میں کسی شاعر کی پہنچ نہیں ہونے پائی تھی۔ یہ دو بدنوں کی روداد نہیں ساری دنیا کے دو محبت کرنے والوں کی کہانی ہے' وہ کہانی جو اولین تخلیق سے شروع ہوئی اور آخری تخریب تک جاری رہے گی۔ نظم کیا ہے ایک سوالیہ نشان ہے؟ اشارہ ہے جذبے کے لاینحل مسئلہ کی طرف! دنیا لاکھ ترقی کرتی جائے یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے اور باقی رہے گا اور شاعر کی آواز گونجتی رہے گی۔

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخہ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے   (گل تر : صفحہ ۱۴)

گل تر اور اس کے بعد کی نظموں پر بھی رومانی فضا طاری ہے لیکن وہ اس سے مختلف ہے جو سرخ سویرا کی نظموں میں ہے وہاں والہانہ پن ہے' معصومیت ہے' تجربہ کی خام کاری ہے۔ بعد کی نظموں میں احساس تجربوں کی شادمانیوں اور ناکامیوں کی بھٹی میں پک کر نکلا ہے۔ اس میں گہرائی اور شدت ہے۔ وہ صفات جب بہت اچھی غزل کے اشعار میں ہوتے ہیں ان میں موجود ہیں۔ اختصار کے ساتھ ابلاغ' بیان کا پہلودار

ہونا، رمزیت سے معنویت میں اضافہ کرنا، نئی تراکیب، نئی امیجری، موسیقی لیا ہوا نیا آہنگ اتنی ساری خوبیاں یکجا ہو گئی ہیں۔

اب وہ قید میں ہوتے ہوئے اپنے پر ہونے والے جبر کو موضوع نہیں بناتے۔ اس عالم میں بھی :

جاگ اٹھتی ہے مری شمع شبستان خیال
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے
شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
ان کے ماتھے پہ تردد کے نقوش
ان کی آنکھوں میں غم دوش اور اندیشہ فردا کا خیال
سیکڑوں لاکھوں قدم
سیکڑوں لاکھوں عوام
سیکڑوں لاکھوں، دھڑکتے ہوئے انسانوں کے دل
جور شاہی سے غمیں، جبر سیاست سے نڈھال

احساس اور خیال میں بھٹکتی ان تصویروں کو پیش کر کے "سرخ سویرا" کی نظموں کی طرح کسی "انقلابی جوش" کا اظہار نہیں کرتے اور نظم کے آہنگ کو متاثر کئے بغیر کہتے ہیں

"جانے کس موڑ پہ یہ دھن سے دھماکا ہو جائیں"

بات مختلف نہیں، انداز مختلف ہے اور تسلسل بیان میں موزونیت کے ساتھ شاعر کے جذبے کو بھی ظاہر کرتا ہے اور پھر ذات کے حوالے سے انقلابی جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مجھے غم ہے کہ مرا گنج گراں مایہ عمر
نذر زندان ہوا
نذر آزادی زندان کیوں نہ ہوا

"تماشائی" میں بھی عزم انقلاب کا پروپیگنڈا نہیں، جذبہ ہے وہ اپنے طبقہ کی

ظاہری کم مائیگی کے باوجود اس کو سطوت شاہی اور قوت جبر کے مقابلہ میں کم تر نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں۔

نہیں ہے ہم میں کوئی آل قیصر' آل عثمانی
نہیں ہے گنج قاروں' تخت جم' تخت سلیمانی

نہ ہم میں طغرل و سنجر نہ ہم میں ظل سبحانی
خدا سویا ہوا ہے جل رہی ہے شمع شیطانی

نہیں رکھتے ہیں کچھ بھی نور عرفانی تو رکھتے ہیں
محل رکھتے نہیں ہیں' زور طغیانی تو رکھتے ہیں

رمزیہ اسلوب نے معنویت میں اضافہ کیا ہے اور انقلابی تصور کو دلنشین بنادیا ہے۔ یہ راز اس دور کے شاعروں پر منکشف نہیں ہوا تھا کہ "نعرہ بازی" وقتی جوش و خروش پیدا کرتی ہے۔ دیرپا تاثر نہیں چھوڑتی اور جو بات جذبے کی سچائی کے ساتھ دلنشین ہو وہ نقش دوام چھوڑتی ہے۔ دوسرے دور میں مخدوم اس راز کو پاگئے تھے۔

مخدوم کی شاعری کے دوسرے دور کی اہم خصوصیت "غزل گوئی" ہے۔ غزل میں طبع آزمائی وہی کرسکتا ہے جو تجربوں کی ایک دنیا رکھتا ہو۔ یہ تجربے خارجی طور پر پیش کرنے کے بجائے اسے احساس اور جذبے کی آگ میں تپاتا ہے جس سے تجربہ کندن بن کر شعر میں ڈھل جاتا ہے۔ جو نقاد اعتراض کرتے ہیں کہ غزل خالص داخلی تجربہ ہے وہ ایک رخ دیکھتے ہیں۔ داخلیت بذات خود کوئی چیز نہیں وہ خارج کا عکس ہے بالکل آئینہ کی طرح! آئینے میں جو کچھ نظر آرہا ہے وہ خارج سے آیا ہے۔ اب یہ آئینہ کے صیقل پر منحصر ہے وہ اسے کس طرح منعکس کرتا ہے مادی' خارجی تجربہ کو احساس اور جذبے کا تجربہ بنادینا ہی غزل کا فن ہے۔ اسی لئے غزل کے شعر کو محسوس کیا جاسکتا ہے سمجھا نہیں جاتا۔ اسی لئے یہاں مخدوم کی غزلوں کے اشعار پر تبصرہ کرنے کے بجائے انھیں انتخاب کے طور پر پیش کرنا مناسب ہے کہ قاری انھیں محسوس کرسکیں اور داد دے سکیں۔

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں، دید یار کریں

وہ عطر تری کاکل شب رنگ نے چھڑکا
مہکی ہے خرد، روح بن کے مہکی ہے

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

یہ میکدہ ہے، نہیں سیر دیر، سیر حرم
نظر عفیف دل پاک باز ساتھ رہے

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

ہجوم بادہ و گل میں، ہجوم یاراں میں
کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

اب کہاں جاکے یہ سمجھائیں کہ کیا ہوتا ہے
ایک آنسو جو سر چشم وفا ہوتا ہے

آج تو تلخی دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

آپ کا ساتھ' ساتھ پھولوں کا
آپ کی بات' بات پھولوں کی

میرے دل میں سرورِ صبحِ بہار
تیری آنکھوں میں رات پھولوں کی

عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

کوئی جلتا ہی نہیں' کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ' پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

"بلا تبصرہ"

اور آخر میں روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن' کی مورخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۹۳ء میں شائع شدہ ایک مضمون سے اہم اقتباس بلا تبصرہ درج ہے۔

"(ڈاکٹر محمد عبدالقدوس) نے ازراہ عنایت کتاب (شمع حقیقت) مجھے بالغرض مطالعہ مستعار دی جو اصلاح عقائد کے موضوعات پر بلند پایہ علماء کی تصانیف کے اقتباسات کا نچوڑ ہے جس کے مولف قاضی محمد علی ایم۔ اے۔ ایم ایڈ عثمانیہ ہیں جو انجمن تحفظات ناموس صحابہ گلبرگہ سے شائع ہوئی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ایسی دینی بصیرت افروز کتاب کو قاضی صاحب نے علامہ اقبال کے اشعار سے زینت نہیں بخشی بلکہ ایک علیحدہ صفحہ انھوں نے مخدوم صاحب کے صرف چار اشعار کے لئے مختص کردیا گویا اس طرح مخدوم صاحب کی خدمت میں انتساب کا حق ادا کردیا۔"

پانچواں باب

غیر مدون کلام :

سرخ سویرا کی اشاعت سے قبل کی نظمیں

نقاد

حکم خاموشی ہے تجھ کو شاعر خوش بیاں
ہوشیار اب تجھ پہ کھلتی ہے ملامت کی زباں

اب تجھے تنقید کے نشتر لگائے جائیں گے
تیری نا اہلی کے اب ڈنکے بجائے جائیں گے

اب تجھے پینا پڑے گا زہر کا لبریز جام
اب بنایا جائے گا تجھ کو اصولوں کا غلام

سینۂ اشعار بے رحمی سے چیرا جائے گا
تیرے دل بندوں کو اب چن چن کے مارا جائے گا

تجھ سے چھینا جائے گا آزادی دل کا نشاں
بند کی جائے گی استبداد سے تیری زباں

تجھ سے دنیا طعن سے، دشنام سے پیش آئے گی
چہرہ مہتاب پر مٹی اڑائے جائے گی

پر گہر کی آب و تابش کو مٹا سکتا ہے کون
سرمدی آواز کو دل سے بھلا سکتا ہے کون

تیرے نغمے ان کے آگے بین سے کچھ کم نہیں
یاد رکھ بوسیدہ تلواروں میں کچھ خم نہیں

مخدوم کی ابتدائی دور کی دو نظمیں "بچے" اور "نقاد" تھیں جو انھوں نے شائع نہیں کروائیں۔ "بچے" محفوظ نہیں رہی اور شاعر کے ذہن سے بھی محو ہو چکی تھی۔

"نقاد" ان کے مسودات میں محفوظ رہی ہے۔ شاذ تمکنت نے اپنی کتاب "مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے" میں صفحہ ۲۴۹ پر درج کیا ہے۔ اس نظم پر جوش ملیح آبادی کی نظم "نقاد" کا غالب اثر ہے۔ یہ کہنا ممکن نہیں کہ نظم کہنے سے قبل جوش کی نظم ان کی نظر سے گزری تھی یا نہیں۔

بلا عنوان

حزن معدوم' مسرت کی گھٹائیں ہوں گی
وصل کا راج' محبت کی فضائیں ہوں گی
راگ بلبل کے' پپیہوں کی صدائیں ہوں گی
تیری سانسوں میں بہشتوں کی ہوائیں ہوں گی

آ بس اب چل کے رہیں دور کہیں دنیا سے

پریاں اتریں گی وہاں ناچ دکھانے کے لئے
نغمے ناہید سنائے گی سلانے کے لئے
کرنیں خورشید کی آئیں گی جگانے کے لئے
حوریں صف بستہ تری زلف بنانے کے لئے

آ بس اب چل کے رہیں دور کہیں دنیا سے

دل میں ایک جوش' طبیعت میں روانی ہوگی
زلزلے عشق کے' الفت کی کہانی ہوگی
ساز ہستی کی ہر ایک ان سہانی ہوگی
ہاں ہم آغوش جوانی سے جوانی ہوگی

آ بس اب چل کے رہیں دور کہیں دنیا سے

(بحوالہ "مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے" از شاذ تمکنت : صفحہ ۲۴۹)

مخدوم کی یہ نظم جس کا انہوں نے عنوان بھی قائم نہیں کیا تھا اختر شیرانی کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" یاد دلاتی ہے۔ نظم شاعر کی بیاض میں محفوظ ہے۔

پیلا دوشالہ

جس دم میں سنا چل بسا وہ ناز کا پالا — وہ پیلا دوشالہ
رنگ اڑ گیا اور دل میں دھنسا بانس کا بھالا — وہ پیلا دوشالہ
وہ کون بلاوڑ(۱) تھا جو چپٹ کر گیا تجھ کو — پٹ کر گیا تجھ کو
تو کونسے موئے کا بنا تازہ نوالہ — وہ پیلا دو شالہ
وہ ماٹھی ملا (۲) کون تھا جو لے اڑا تجھ کو — چھوڑا وہ کیوں مجھ کو
جانے سے ترے ہوگیا یاں عیش کسالا — وہ پیلا دوشالہ
کیوں چھین لیا او ملک الموت کے بچے — او عقل کے کچے
مجھ سے وہ مرا ماہ جبیں، بانکا نرالہ — وہ پیلا دوشالہ
اب کون تجھے گود میں لے لے کر سلائے — بے بس ہوں میں ہے ہے
جاتا رہا وہ راحت جاں، دل کا اجالا — وہ پیلا دوشالہ
او گرم کن پہلوئے من باز بیائی — گریم ز جدائی
آں روز بیاد آرکہ من زیر تو بالا — وہ پیلا دوشالہ

اس نظم کی شان نزول کے بارے میں مخدوم کے جامعہ کے ساتھی مرزا ظفرالحسن نے لکھا ہے

''اس شعری تخلیق کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ ''فرحت منزل'' نام کی بورڈنگ میں جہاں مخدوم بھی مقیم تھے نئے آنے والے لڑکوں سے جبرا مٹھائی کھائی جاتی تھی۔ پرانے بورڈر مٹھائی کھانا اپنا حق اور مٹھائی کھلانا نئے بورڈر کا فرض سمجھتے تھے۔ ایک ناتجربہ کار یا سر پھرے لڑکے نے جو گاؤں سے نیا نیا آیا تھا حق اور فرض دونوں سے انکار کردیا تو ایک دن موقع پاکر اس کا ایک نیا دوشالہ چرالیا گیا جس کا رنگ پیلا تھا۔ اس کے بعد بورڈنگ کے ایک دلچسپ تعزیتی جلسہ میں دوشالہ کے مالک سے اظہار

۱۔ ''بلاوڑ'' حیدرآباد میں موٹے تازے خوفناک بلے کو کہتے ہیں

۲۔ ''ماٹھی ملا'' حیدرآباد کے روزمرہ میں بد دعایا کوسنے کے لئے روزمرہ ہے اس کا مطلب ''اللہ اسے مٹی میں ملائے'' ہوتا ہے۔

تعزیت کیا گیا۔ مخدوم نے اس جلسہ میں ایک نظم پڑھی "پیلا دوشالہ" جو آن کی آن میں مشہور ہو گئی۔ پہلے تو دوسری دو ہاسٹلوں "مسرت منزل" اور "نظامت منزل" کے لڑکوں نے مخدوم کو بلوا کر سنی، پھر یہ یونیورسٹی پہنچی، وہاں سے دوسرے کالجوں میں، اسکولوں میں حتیٰ کہ نجی محفلوں اور گھروں میں سنی اور گائی جانے لگی"

(مرزا ظفر الحسن : عمر گذشتہ کی کتاب : مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۸ء : صفحہ ۴۲)

"اس نظم نے جامعہ کے سنجیدہ اور بزرگ اساتذہ کو چونکا دیا اور وہ پوچھنے لگے مخدوم کون ہے؟ مولوی عبدالحق نے بطور خاص مخدوم کو بلوا کر یہ نظم اور اس کی کہانی سنی اور کہا "یہی وہ باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کتنے زندہ دل ہیں۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔" خلیفہ عبدالحکیم نے یونیورسٹی کلب میں فارسی شعر کی بڑی داد دی اور کہا "من زیر تو بالا" کا اس سے بہتر استعمال میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔" (بحوالہ عمر گذشتہ کی کتاب : صفحہ ۴۴)

جامعہ کے ایک اور ساتھی یحییٰ صدیقی نے بھی نظم کے پس منظر کی یہی تفصیل اپنے مضمون "مخدوم، اقامت خانے میں" (مشمولہ رسالہ "صبا" حیدر آباد دکن، مخدوم نمبر، ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۷۶) بیان کی ہے۔ نظم برسوں کہیں شائع نہیں ہوئے۔ ایک زندہ شہ پارہ کی طرح سینوں میں محفوظ رہی اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی۔

ایک چاندنی رات

ہٹ گئی عالم سے وہ پرہول شب کی تیرگی
فرقِ مشرق پر رکھا قدرت نے تاجِ زر نگار
توڑ کر طوفان اٹھا، پھیلا غبارِ مرمریں
روئے گیتی پر چڑھا پھر نوجوانی کا نکھار

چاندنی ہے یا فرنگن کا عروسی پیرہن
چادرِ سیماب میں یا سیم تن ہے بے قرار
چاند کا وہ بہتے پانی پر تڑپنا، لوٹنا
ساحلوں سے مضطرب موجوں کا وہ بوس و کنار

چاندنی میں آبشاروں کی وہ ٹھنڈی راگنی
وہ ندی کا پیچ و خم، وہ کوہساروں کا ابھار
آبشاروں کی صدا سے دل میں پیدا زیر و بم
رقص کرنے کی تمنا چھیڑتی ہے دل کے تار

وہ فرازِ کوہ کی مسرور کن بادِ لطیف
روحِ انساں مست جس سے جیسے مے سے بادہ خوار
ذرہ ذرہ دہر کا تھا عشق میں ڈوبا ہوا
مست نعرے جا رہے تھے آسمانوں سے بھی پار

تھا جوانی کا لہو گردش میں رقصاں زندگی
ہاتھ میں مینائے شب پہلو میں مہ پارہ نگار
وہ حجاب آمیز چشمِ ہم نشیں کی التجا
دل کے ارماں جس میں پوشیدہ قطار اندر قطار

شوق کے پنجے میں سیمیں ساعدوں کی بے بسی
دل کے ہاتھوں دامنِ صبر و تحمل تار تار

نفس کی جنبش بڑھی، بگڑا تنفس کا نظام
سانس کی گرمی لبوں کو چھو رہی تھی بار بار

عالم بالا میں ہم پر نور برسایا گیا!
ہو رہی تھی ہر کلی کو گدگدی بے اختیار

صبح دم دیکھا ستاروں نے، سحر نے، چاند نے
جن کے چہروں پر تبسم تھا نگاہوں میں خمار

سو رہا تھا حسن بے سدھ عشق کی آغوش میں
تھا وہیں کچھ مرجھائے ہوئے پھولوں کا ہار

(بحوالہ "مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے" از شاذ تمکنت : صفحات ۲۴۳، ۲۴۴)

معمہ

ملائک نے مجھے سجدہ کیا تھا
خلافت کا نشان مجھ کو ملا تھا
خدا نے روح پھونکی تھی بدن میں
اس کے خاص ہاتھوں سے بنا تھا

عطا کی خلعت شرف خلائق
بڑی بخشش تھی اک عالم ہلا تھا
تمنائے الوہیت کا پیکر
عبودیت کے سانچے میں ڈھلا تھا

بنا میرے تھی بزم عشق پھیکی
یوں کہنے کو فرشتے تھے خدا تھا
جو پوچھو کن سے پہلے کون کیا تھا
میں بندہ تھا، خدا تھا، جو بھی تھا، تھا

مجھے پھینکا گیا اس خاکداں میں
جو آغوش الٰہی میں پلا تھا
مری لغزش سراپا بندگی تھی
کسی کی قہر انداز وفا تھا

وہی میں ہوں کہ انجام تباہی
وہی میں کہ آفرینش کی بنا تھا
جہاں تیرگی ہے اور میں ہوں
وہی میں عرش کا دیا تھا

کوئی بتلائے کیا ہوتا ہے آگے
کوئی کہہ دے میں کیا ہوں کیا تھا

(مخدوم محی الدین بی اے عثمانیہ)

(بحوالہ مجلہ عثمانیہ : جلد ہشتم، شمارہ ۲۱ : ۱۳۴۴ فصلی (م ۱۹۳۵ء) صفحہ ۸۰)

آری سہیلی

اس جھوٹے سنسار کو چھوڑیں
پاپ کی بستی سے منہ موڑیں
جھوٹے جگ کے ناتے توڑیں
ٹوٹے دل کے رشتے جوڑیں
آری سہیلی جھولا جھولیں

اپنی دنیا پیت کی دنیا
بے فکری کے گیت کی دنیا
پھول سی سیج ہماری دنیا
ہم پیارے اور پیاری دنیا
آری سہیلی جھولا جھولیں

ہرے ہرے رمنوں میں گھومیں
پتے پتے کا منہ چومیں
من کی رسیلی تان پہ جھولیں
آری سہیلی جھولا جھولیں

آ آکاش سے تارے لائیں
تاروں کا ایک ہار بنائیں
اپنے کنہیا کو پہنائیں
اور لیں جھٹ پٹ اس کی بلائیں
آری سہیلی جھولا جھولیں

گھٹائیں سنسار پر چھائیں
رم جھم برسیں موج منائیں
دکھی دل کی آگ بجھائیں
ہنس ہنس کر روتوں کو منائیں
آری سہیلی جھولا جھولیں

چومے گی ہریالی پاؤں
میٹھی نیندیں ٹھنڈی چھاؤں

(بحوالہ "مخدوم محی الدین" حیات اور کارنامے از شاذ تمکنت : صفحات ۲۴۱، ۲۴۲)

گیت غیر مکمل رہ گیا۔ اس میں حفیظ جالندھری کے گیتوں کا رنگ بھی شامل ہے اور شاعر کی انفرادی شان بھی۔

مئے

یہ کالی کالی بدلیاں
یہ شام لے کے کیا کروں

یہ نوجوانی یہ جنوں
یہ جام لے کے کیا کروں
یہ شام لے کے کیا کروں
یہ جام لے کے کیا کروں

آ مرے دل کو آزما
آجا وہ ساز زندگی

او مستیوں کی جان آ
آجا وہ راز زندگی
یہ شام لے کے کیا کروں
یہ جام لے کے کیا کروں

وہ نامہ خلد بریں
وہ غنچہ روح الامیں

وہ سلسبیل انس و جاں
وہ ناز نیں، ناز آفریں
یہ شام لے کے کیا کروں
یہ جام لے کے کیا کروں

وہ خنکیوں کی انجمن
وہ رنگ و بو کی داستاں

دنیا کے حق میں ایک لے
میرے لئے دونوں جہاں
یہ شام لے کے کیا کروں
یہ جام لے کے کیا کروں

(بحوالہ "مخدوم محی الدین، حیات اور کارنامے" از شاذ تمکنت : صفحات ۲۵۸، ۲۵۹)

پاکستان ہمارا

آزادی کی دھن میں کس نے آج ہمیں للکارا — سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا
خیبر کے کہروں پر چمکا ایک ہلال اک تارا — پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا

پاکستان ہمارا۔ پاکستان ہمارا

سو انجیلوں پر ہے بھاری اک قرآن ہمارا — ہر ترک اپنا' ہر حر اپنا' ہر انسان ہمارا
روک سکا ہے کوئی دشمن کب طوفان ہمارا — ہر شخص اک انسان یہاں ہے ہر انسان ہمارا

پاکستان ہمارا۔ پاکستان ہمارا

یہ "ترانہ پاکستان" اسرار الحق مجاز کے مجموعہ کلام "آہنگ" کے صفحہ ۷۶ پر چھپا ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہ مخدوم اور مجاز کی مشترکہ شعری کاوش ہے۔ نظر حیدر آبادی اسے مخدوم کی تخلیق بتلاتے ہیں۔ مخدوم سے ذاتی واقفیت اور جس مشاعرے میں مخدوم نے اسے سنایا تھا اس میں موجودگی کی بناء پر ان کے بیان کو صدقہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ نظر نے لکھا ہے

> "مخدوم' نے "ترانہ پاکستان" بھی لکھا تھا جسے مجاز نے اپنی دماغی علالت کے زمانہ میں تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اپنے نام سے شائع کردیا۔ اس کی اشاعت کے فوراً بعد کمیونسٹ پارٹی کے مشہور اخبار نیا زمانہ بمبئی نے حقیقت حال کا انکشاف کردیا"
>
> (نظر حیدر آبادی : کتاب "اقبال اور حیدر آباد" : مطبوعہ کراچی : فٹ نوٹ صفحہ ۱۳)

صحیح صورت حال کا انکشاف مرزا ظفر الحسن نے کیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جب کل ہند ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس حیدر آباد دکن میں منعقد ہوئی ظفر الحسن دکن ریڈیو سے وابستہ تھے۔ اس موقع پر دکن ریڈیو نے کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا وہ اس کے منتظمین میں شامل تھے اور مشاعرے میں موجود تھے۔ وہ لکھتے ہیں

"(میں نے) نشرگاہ حیدر آباد سے ایک خاص مشاعرہ بھی نشر کیا

جس میں تمام بیرونی شعراء نے حصہ لیا اور اسی میں اپنی نظم "پاکستان ہمارا" نشر کی"

(مرزا ظفر الحسن : عمر گزشتہ کی کتاب : مطبوعہ کراچی۔ جنوری ۱۹۷۸ء : صفحہ ۱۰۷)

ظفر الحسن نے "ذکر یار چلے" میں مزید وضاحت کی ہے

"مشاعرہ ختم ہونے کے بعد کرشن چندر نے مجھ سے کہا حیدر آباد ریڈیو بڑا ترقی پسند اسٹیشن ہے اگر تم یہ نظم آل انڈیا ریڈیو سے نشر کرواتے تو انگریز تمھیں اور تمھارے پورے خاندان کو سولی پر لٹکا دیتا"

(مرزا ظفر الحسن : کتاب "ذکر یار چلے" مطبوعہ کراچی : صفحہ ۳۹۴)

کامریڈ کے ایل مہندرا کمیونسٹ پارٹی میں عرصہ دراز تک مخدوم کے ساتھ کام کرتے رہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے

"پارٹی نے پاکستان کی تحریک کی حمایت شروع کردی تھی لیکن بعد میں نظر ثانی کے بعد حمایت ترک کردی۔ انھوں نے (مخدوم نے) وہ نظم لکھی جس میں "پاکستان ہمارا" کے نعرہ کو ایک عوامی نعرہ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا تھا۔ مخدوم کو پارٹی کے فیصلوں میں نظرثانی کے بعد اس نظم کے مضمرات پر بھی غور کرنا پڑا اور انھوں اسے اپنے کلام سے خارج کردیا مگر عرصہ تک یہ نظم محفلوں اور مجلسوں میں داد تحسین حاصل کرتی رہی۔"

(کے۔ ایل مہندرا : مضمون "کامریڈ مخدوم" مشمولہ رسالہ نیا آدم' مخدوم نمبر' حیدر آباد دکن : جنوری ۱۹۷۰ء : صفحہ ۷۷'۷۸)

"ترانہ پاکستان" عرصہ تک کمیونسٹ پارٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مزدوروں کے جلسوں میں بھی پڑھا جاتا رہا۔ ممکن ہے مجاز نے اس میں لفظی رد و بدل بھی کیا ہو' لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مخدوم کی شعری کاوش ہے اور وہ ایسے "ترقی پسند" شاعر تھے جو قیام پاکستان کے حامی بھی تھے۔

ہٹی ہڑتال

وہ تھے ہمارے پیارے منسٹر
اجلے اجلے سندر، سندر
ایک جو چیف تو دوسرے لیبر
شری سپاری، شری چقندر

ایک بٹیر تو دوسرے تیتر
جان ٹیلر کے پنجرے کے اندر
شری شری اور شری جان ٹیلر
تینوں کے تینوں قلعے کے اندر

سونے کی دیوار قلعے کی
سونے کی تلوار قلعے کی
سونے کی جھنکار قلعے کی
صورت ہے خونخوار قلعے کی
سیرت بدکردار قلعے کی

اپنے جائز حق کو جتانے
اپنی کم تنخواہ بڑھانے
خاک سے سونا بنانے والے
محنت کش مزدور جیالے
بھوک اور کشٹ ہے مرنا جینا
سونا جن کا خون پسینا
آندھی اور طوفان سے لڑنے
شری شری جان سے لڑنے

لال پھریرا ہاتھ میں لے کر
نکلا مزدوروں کا لشکر
منتری منڈل کانپے تھر تھر
قانونی ہڑتال ہے سر پر
گھر میں رہ کر گھر سے باہر
کہلا بھیجا نہیں ہوں اندر
ایک کی ٹانگ کو کاٹا مچھر
ایک گھسا بستر کے اندر
بخار ایک سو دس سے اوپر
چڑھا ہوا سرکار کا ٹمپر
مزدوروں کی بات نہ مانے
ہزار چکر لاکھ بہانے
ان کا سونا چاندی پتمبر
مزدوروں کے پیٹ پہ پتھر
واہ اے تیرا پیار منسٹر
تجھ پہ خدا کی مار منسٹر

گاندھی جی کی بات تو مانو
سچی بات کو سچا مانو
اپنی ہٹ کو چھوڑو دیوانو

جب تک تم نے یہ بات نہ مانی
بند رہے گا حقہ پانی
تب تک مل بھی بند رہے گی
تب تک یہ ہڑتال چلے گی

بھارت کے صوبہ آندھرا پردیش میں ہٹی ایک مقام ہے جہاں سونے کی کان ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں کان کنوں نے ہڑتال کی تھی۔ ان کی قیادت کے لئے مخدوم وہیں موجود تھے اور مزدوروں کا یہ ترانہ تحریر کیا جو طنز و مزاح کے علاوہ ان کے بیباک اظہار و خیال کا نمونہ ہے۔ شاذ تمکنت کے مطابق انھوں نے خط کے ساتھ اسے اپنی بھتیجی صفیہ اور بیٹے نصرت محی الدین کو بھیجی تھی۔ خط میں لکھا تھا

"عزیزی صفیہ اور نصرت!

تمھارے لئے یہ نئی نظم بھیج رہا ہوں۔ بہت سہل زبان ہے۔ تم بہ آسانی سمجھ جاؤ گے۔ گھر میں سب کو بھی پڑھ کر سناؤ۔ نصرت کو تو چاہئے کہ میرے آنے تک زبانی یاد کر کے مجھے سنائے۔ جان ٹیلر کمپنی ایجنٹ کا نام ہے۔ یہ انگریزی کمپنی ہے جو سونے کے کان کا انتظام کرتی ہے اور ہر سال ایک لاکھ ۳۳ ہزار مفت میں معاوضہ لیتی ہے۔ چیف سے مراد اپنے چیف منسٹر ہیں جن کا قد چھوٹا ہے اسی رعایت سے وہ شری سپاری ہیں اور لیبر سے مراد لیبر منسٹر ہیں جو موٹے تازے ہیں۔ اسی رعایت سے چقندر ہیں۔ بٹیر چھوٹا ہوتا ہے تیتر بڑا۔ یہ دونوں چالاک پرندے سمجھے جاتے ہیں۔ باقی صاف ہے۔

"تمھارا مخدوم"

(بحوالہ "مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے' از تمکنت : صفحات ۲۶۰' ۲۶۲)

گل تر کے بعد کا غیر مدون کلام :

قوالی

میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
یہ دار کس کے لئے، السلام کس کے لئے
الف سے لے کے غرض والسلام کس کے لئے
میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
یہ میسرم کی(۱) بیٹی کس کی(۲)، جام کس کے لئے
یہ پانی میرا تو پھر قوام کس کے لئے
میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
پھٹے پچھائے سے اس پیرہن میں کیا جائیں
لٹی لٹائی سی اس انجمن میں کیا جائیں
میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
یہ شہر کیا ہے ذرا میری انجمن میں چلو
ہری(۳) کھندلے(۴) کسی دن تو تاڑ بن میں چلو
میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
ہماری بھوک میں بیٹھ کر ہمارے در تو چلو
نہاری گر نہیں کھاتے نہ کھاؤ گھر تو چلو
میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
بجی سجائی دلہن بن کے لیڈری آئے
یہی دعا ہے مرے گھر تو نگری آئے
میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
یہ ایک کیا ہے یہ دو کیا ہیں چار چار کرو
ہزار بار نہیں دس ہزار بار کرو
میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
شراب ناب حقیقت پلاؤ ملت کو
پلاؤ گر نہیں کافی تو کھاؤ ملت کو
میرے میاں کے لئے

کچھ اور چاہئے وسعت مرے میاں کے لئے
میرے میاں کے لئے

نظم حیدر آباد شہر کے خاص سیاسی پس منظر میں لکھی گئی ہے اس کے بارے میں شاذ تمکنت نے لکھا ہے

"فروری ۱۹۶۲ء میں آندھرا پردیش اسمبلی کے الیکشن تھے۔ شاہ علی بنڈہ

ے راج بہادر گوڑ پارٹی کی نمائندگی کر رہے تھے۔ مخدوم نے ان دنوں ایک قوالی لکھی تھی جو کورس کی شکل میں جگہ جگہ پرانے شہر میں گلی کوچوں میں لڑکے گاتے پھرتے تھے" (مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے : صفحہ ۲۶۷)

ممکن ہے اسے سیاسی طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ حقیقی پس منظر کے بارے میں قمر ساحری نے ہمیں بالمشافہ بتلایا کہ اس وقت کے مجلس اتحاد المسلمین کے صدر اپنے فرزند کو مجلس کا جانشین بنا کر نہ صرف اسی سیاسی تنظیم کو بلکہ جملہ متعلقات کو وراثت میں منتقل کرنے کے درپے تھے۔ نظم مجلس اتحاد المسلمین اور اس کے صدر کے خلاف ہے ساری حکایت بہ زبان صدر ہے اور "میاں" کا اشارہ ان کے فرزند ارجمند کی طرف ہے۔ "یہ دار کسی کے لئے السلام کسی کے لئے" میں واضح اشارہ "دارالسلام" کی طرف ہے جو مجلس کا صدر مرکز تھا۔

فٹ نوٹ :

۱۔ میسرم کی پپئی = شہر کے مضافاتی علاقہ کا نام میسرم ہے جہاں کی پپئی یعنی پپیتا مشہور ہے۔

۲۔ جام یعنی امرود ۳۔ ہری سے مراد ہریالی یا سبزہ ہے ۴۔ کھندلنا : روندنا' پامال کرنا

۵۔ تاڑبن : علاقہ کا نام' لفظ مراد ایسی جگہ جہاں تاڑی کے درخت ہوں۔ حیدر آباد میں ایک روایت تھی کہ آخری چہار شنبہ کو سبزہ کو کھندلا جاتا جس سے خوش نصیبی کی آمد کا شگون وابستہ تھا۔

غیر مکمل نظم کا ایک بند :

رام دھن ہیں جو سناتے تھے اہنسا کے بھجن
کیا کرامت ہے وہی بن گئے آئین شکن
پیچھے پیچھے ہیں حریفانِ کہن کف بہ دہن
تم نے دیکھا نہیں، کیا ہوتا ہے مزدور کا تھن

فردیات :

کابل ہو، تاشقند ہو یا کوکہ تبلی
ہندوستان کا درد نہاں ساتھ ہے

صبحِ جمال و شامِ رفاقت، نشاطِ غم
کیا کیا نہ ساتھ لائے تری انجمن سے ہم

وہ جو اپنا تو پھر ہر چاند اپنا، چاندنی اپنی
سحر اپنی، سحر کا نور اپنا، زندگی اپنی

اب ان کی عنایت کا اثر ہونے لگا ہے
کچھ درد مرے دل میں سوا ہونے لگا ہے

ہوائیں ہیں مگر چلتی نہیں قیامت ہے
گھٹا جاتا ہے دم کیا حبس بے جا ہے معاذ اللہ

ہم سے دیوانے کہاں ملتے ہیں دنیا میں مگر
آپ جیسے بھی طرحدار کہاں ہوتے ہیں

ہے دشت دشت اسی برگِ گل کا افسانہ
قدم قدم پہ ملی ہے بہار رستوں میں

میرے دل میں سرورِ صبحِ بہار
تیری نظروں میں رات پھولوں کی

بساط رقص کرنے کے بعد کا غیر مدون کلام

فلمی گیت :

مخدوم کی نظم "چارہ گر" کو چندر شیکھر نے اپنی فلم "چا چا چا" میں پیش کیا تھا۔ فلم کا حال تو معلوم نہیں لیکن نظم "اک چنبیلی کے منڈوے تلے" کے نام سے صرف برصغیر پاک و ہند میں نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں مشہور ہوئی۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کئی فلمی پروڈیوسروں نے ان کی خدمات حاصل کرنا چاہیں اور بڑے سے بڑے معاوضہ پر انہیں بمبئی بلایا۔ وہ بمبئی میں قیام پذیر ہونے پر آمادہ نہیں ہوئے حالانکہ کیسے کیسے ترقی پسند فلمی دنیا کی رنگینیوں اور روشنیوں میں کھو چکے تھے۔ وفات سے چند ماہ قبل مخدوم نے فلم "برسات" کے لئے دو دن گیت لکھ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ چند دن بعد فلم کے میوزک ڈائرکٹر من موہن بھی چل بسے اور یہ گیت ریکارڈ نہ ہو سکے۔

گیت (۱)

دیکھو چھیڑو نا، بندیا کہیں نہ مری شور مچائے

سنو جی، مرا آنچل ڈھلکے

دل کی گگریا چھلکے

مست گھٹائیں گھر آئیں سجنا، دیکھو چھیڑو نا

بدن ہے مہکا مہکا

من کا پپیہا چہکا

مہکی ہوائیں پھر آئیں، سجنا، دیکھو چھیڑو نا

سکھی نہ سکھیوں کا جھمیلا

رات کا کاجل پھیلا

متوالی آنکھیں شرمائیں، سجنا، دیکھو چھیڑو نا

گلے کا جگنو چمکا

کان کا موتی دمکا
بے کل زلفیں لہرائیں، بجنا، دیکھو چھیڑو نا
دیکھو جی کوئی پتہ کھڑکا
میرا کلیجہ دھڑکا
دیکھے نہ کوئی، گھبراؤں، بجنا، دیکھو چھیڑو نا
اک گھونگھٹ دو مکھڑے
دونوں ہیں چاند کے ٹکڑے
شرم سے کانپوں تھراؤں، بجنا، دیکھو چھیڑو نا

گیت (۲)

میں دور دور کیوں رہتا ہوں یہ آج بتانا ہے تجھ کو
ترا روپ نیا ترا رنگ نیا
ترا سر سے پا تک انگ نیا
ہلچل میں جوانی کا دریا
ہے حسن قیامت، عشق بلا
میں دور دور ہی دور بھلا
میں دور دور کیوں رہتا ہوں یہ آج بتانا ہے تجھ کو
ترے من میں پھولوں کا میلا
ترا من ہے چنچل البیلا
گالوں میں گلال کے دیپ جلے
کہیں راکھ نہ کر ڈالے شعلہ
میں دور دور ہی دور بھلا
میں دور دور کیوں رہتا ہوں یہ آج بتانا ہے تجھ کو

آنکھوں میں اوشا کی سی لالی

ہے کمر کے پھولوں کی ڈالی

ہے مٹکی مٹکی بھینسی بھینسی انگیا

سینہ کا ابھار اللہ اللہ

شاعر تو اپنے دل کو بچا

میں دور دور ہی دور بھلا

میں دور دور کیوں رہتا ہوں یہ آج بتاتا ہے تجھ کو

سمٹا سمٹا چاندی سا بدن

بکھرا بکھرا رنگ کا کندن

ترے حسن کی خوشبو چمن چمن

اللہ رے شرمیلا پن

اس چاند کو لگ جائے نہ گہن

میں دور دور ہی دور بھلا

میں دور دور کیوں رہتا ہوں یہ آج بتاتا ہے تجھ کو

بلا عنوان

مرے ہوئے چاند کے کفن سے
سحر کی زردی ابھر رہی ہے
فصیل کے کنگروں سے پھوٹی کرن کی سرخی
میں بد وقت کی بد روی سے تھک کر
سڑک کنارے
اداس بیٹھا
نڈھال بیٹھا ہوا ہوں
سڑک سے اس پار
اس کنارے
دکان کی سیڑھیوں
یہ بیٹھا
اداس بچہ
بڑی بڑی آنکھیں کھولے
خالی سڑک کو گھورتا ہے
پچاس برسوں کی گردش
پچاس چکر
زمیں کے سورج کے گرد گزرے
مکان کی
سیڑھیوں پہ
بیٹھا ہوا اداس بچہ
نہیں کوئی اور
وہ تو میں ہوں

(بحوالہ "مخدوم محی الدین، حیات اور کارنامے" از شاذ تمکنت : صفحات ۳۴۲، ۳۴۳)

سڑک

یہاں کیا ہے
اس راہ میں
کچھ نہیں
درد و افلاس کی چھاؤں والے
درختوں کی شاخوں میں
لٹکے ہوئے
آہ کے چیتھڑے

رسالہ "صبا" حیدر آباد بابت اگست ۱۹۶۸ء صفحہ ۶۰ پر مخدوم کی دو نظمیں چھپی تھی "سڑک" اور "اپنا شہر" موخر الذکر نظم "مخدوم" کلام مخدوم" مطبوعہ کراچی ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۲۶۵ پر موجود ہے لیکن "سڑک" کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔

واک آوٹ

آگے گئے فلاں، پیچھے پیچھے ابن فلاں جارہے ہیں
اپنے سائے سے لڑتے جھگڑتے ہوئے
بڑبڑاتے، بگڑتے، جھگڑتے ہوئے
منہ میں عف عف لئے
تہ بہ تہ کف لئے جارہے ہیں
کچھ بچارے مقدر سے معذور ہیں
عقل سے دور ہیں
محو حیرت ہے دنیا، جہاں دنگ ہے
فکر میں لنگ ہے

جارہے ہیں
خم کو اوندھا کئے، جام و سبو توڑ کر
میکدہ چھوڑ کر
دین و دنیا سے منہ موڑ کر
پٹ پٹا کر وہ پیر مغاں جارہے ہیں
آگے آگے فلاں، پیچھے ابن فلاں جارہے ہیں

(بحوالہ "مخدوم محی الدین، حیات اور کارنامے : صفحات ۲۶۷، ۲۶۸)

Confinement

ترجمہ : "قید"

"Mukhdoom" Mohinddin

Confinement, indefinite
Tyranny and no recourse
Night; silence; loneliness.
From somewhere, far from prison walls,
From the heart of the city, bursts forth the
Sound of bells.

My mind startled,
And breath's flame flickers
Rekindles thoughts
Recalls memories of life; of all:
Crowds on street and road;
Their busy steps;
Foreheads wrinkled from care;
Eyes reflecting life's past sorrow with bleak
Thoughts of tomorrow.
Tens of thousands of steps,
People,

Throbbing hearts
Depressed by imperial command, by tyrannous rule.
Who knows at what turn they will explode.

Helpless, cramped for many years, Youth's verve
Sleeps, embracing shackle and chain.
Turning over, clanking chains
Echoes tumult and pains of life in dreams.

I grieve that my life — my priceless years
Were spent in jail,
And why not spent in freeing this prison, my land?

Translated by
M.H.K. Qureshi, Carlo Coppola

The Meadow of Moon and Stars

(Before and After Independence and For The Future)

ترجمہ : "تاروں کا بن"

"Mukhdoom" Mohinddin

Bodies of us martyrs burned as wax
All night long,
Flickered the candle of country's dawn;
Shone the meadow of moon and stars.

There was indigence, yet;
Awaiting men and women
With their empty bowls of thirsty eyes
Felt overwhelmed.
Revelry, gaity and the wanton pleasures
All ended.
The night's bright fervent bodies,
In the morn
Turned into a wailing wall,
Became a throny jungle of grief.
The leaping blood of night's arteries
Changed into a blood stream.

Some masters of deceit,
Their breath a viper's hiss
Breasts filled with black smoke of hate
Flicked their tongues
From a hidden place
And sucked the blood of the morning light.

The night's bitterness and the darkness remain
And some scattered morning lights too.
Friends!
Hold hands.
Lets march to our destination.
Of love,
Of gallows,
And the beloved's street.
Let us go and carry our own crosses.

Spirit Of Love

ترجمہ : "جانِ غزل"

"Mukhdoom" Mohinddin

Dance today my unfulfilled heart,
Till the lotuses of tears blossom
In the lakes of my charmed eyes —
While walking on an unfamiliar road,
I met someone, the very Spirit of love.

Today, world's sorrow should not come to mind.
Wet eyes! Smile with all your heart.
The moon-glow of cheeks radiates today,
Cloud's cover gone and the tangled paths unravelled.
What a drudgery was this life's journey!

O! my love,
Let us sit down for a while
Under the shadow of dream,
And drink the wine of the present pleasure.
Roads are awaiting with welcoming flowers.
Come, walk with me
A bit further
Through the heart's lonely corridors.

Meeting

ترجمہ : "ملاقات"

"Mukhdoom" Mohinddin

I have swallowed the sun
Breath has quickened.
Thirst and more thirst
You descended from the land of light and fragrance
And became the sun.

The crystal aeroplane above the clouds
Glides through,
Dark night on one side
And red sword of twilight on the other.

The sky — red all over —
Crimson-red,
Stars and moon accompany
As does my love, the music of my life.
Eternal is every movement
Of this fleeting journey.
God!
May this journey never end!

Stillness

ترجمہ : "سناٹا"

"Mukhdoom" Mohinddi

No heart beat
No footsteps
No commotion.
Nor a wave.
No movement
Nor the warmth of someone's breath.
Or a body.

In this hushed stillness
At least a leaf must crackle.

A melting pearl
A tear drop
A heart
Nothing.
How desolate is this road?

Some cheek must glow.
Lightening must strike.

Piece Of Heart

ترجمہ : "لختِ جگر"

"Mukhdoom" Mohinddin

You may throw love in a deep well,
But a voice will follow you.
Sometime as a song of moonlit-night,
Sometime as a mad laughter of pitch darkness.
It will follow you,
A voice will follow you.

That voice —
The unwanted child, without father,
One day
Through the cross,
Became a guide to mankind,
Then a God.

A mother
Many years ago,
Fearing the world,
Left a child, her piece of heart
At the wayside.

That unwanted child, without father,
One day
Through the cross,
Became a guide to mankind,
Then a God.

Healer

[illegible]

"Mukhdoom" Mohinddin

Beneth the jasmine canopy
Beyond the tavern at the turn
Two bodies
Burned in the flames of love

Love, a word of faith
Love, their God
Love, their pyre.
Two bodies moist in dew, drenched in moonlight,
Two fresh faces like fresh flowers of early morn.
Garden's cool soft breeze
In the mourning.

Dark tresses coiled on hot cheeks, strayed.
We saw them
At night and day,
In darkness and light.
Mosque's minaretts saw them,
Temple's doors saw them,
Tavern's openings saw them
At the beginning to the eternity.
Tell me O' healer
In your bag
Do you carry a prescription for love,
Any panacea, medicine for it?

Beneth the jasmine canopy
Beyond the tavern at the turn
Two bodies
Burned in love-fire
O' healer.

Darkness

ترجمہ : "اعجاز"

In night's hands, a begging bowl,
These stars, this moon
Contented with borrowed light;
This radiance: this their bridal gown. And shroud.
In this darkness, the haunt of Satan's hounds,
Break the cries of dying souls.
Civilization's wounds —
Trenches,
Barbed wire
Entangled with human bodies,
Now a vulture's perch;
Cracked skulls,
Bodies without hands, without legs.
About the skeletons only cold winds
Wail and moan.
In night's stillness spill
Child's and mother's tears,
And the lamentations of moon and stars
On night's forehead gather sorrowful stars
To mourn till the sun rises.
Night has nothing to give but darkness —
Nothing — but darkness.

ساتواں باب

مخدوم کے شعری مجموعے

سرخ سویرا : سلسلہ مطبوعات اشاعت گھر : حیدر آباد دکن : جنوری ۱۹۴۴ : صفحات ۱۲۱

(اس میں سبط حسن کا خط بنام مخدوم بطور پیش لفظ شامل ہے۔ مجموعہ میں ۴۸ نظمیں، ۴ قطعات اور ۶ فردیات ہیں)

گل تر : مکتبہ صبا، حیدر آباد دکن : اگست ۱۹۶۱ : صفحات ۸۸

(مخدوم کا لکھا ہوا مقدمہ "پڑھنے والوں سے" شامل ہے۔ ۱۹۴۴ سے ۱۹۶۱ تک کا کلام ہے۔ جملہ ۲۰ نظمیں، ۲۹ غزلیں، ایک قطعہ، غیر مکمل نظم کے دو بند اور غیر مکمل غزل کے دو شعر ہیں)

مخدوم اور کلام مخدوم : مرتبہ مرزا ظفر الحسن : شائع کردہ کتب پرنٹرز و پبلشرز : کراچی، ۱۹۷۲ : صفحات ۲۸۸

(یہ مخدوم کا مکمل "کلیات" ہے۔ صرف دو نظمیں "تلنگانہ" اور "نہرو" شامل نہیں ہیں۔ بساط رقص کے بعد کے کلام میں ۹ نظموں، ایک واسوخت اور ۲ غزلوں کا اضافہ ہے۔ تعارف مرزا ظفر الحسن نے لکھا ہے، سبط حسن کا خط مخدوم کے نام جو سرخ سویرا میں چھپ چکا ہے، گل تر کا مقدمہ "پڑھنے والوں سے" اور جامعہ ملیہ دہلی کے ایک اجتماع میں مخدوم کی گفتگو بھی شامل ہیں)

انتخاب کلام مخدوم :

مرقع سخن (شعرائے جامعہ عثمانیہ) مرتبہ معین الدین قریشی و عبد القیوم خان

باقی : ادارہ ادبیات اردو : حیدر آباد دکن ۱۹۳۹ء
انتخاب کلام مخدوم : شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۲ء
مخدوم کے سو شعر : شائع کردہ مطبوعات مخزن : حیدر آباد دکن : ۱۹۵۴ء
حیدر آباد کے شاعر : مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد : ساہتیہ اکادمی : حیدر آباد : آندھرا پردیش ۱۹۵۸ء
رسالہ صبا : مخدوم نمبر اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۹ء : حیدر آباد دکن

اشاریہ کلام مخدوم :

منظومات :

آتش کدہ : مجلہ عثمانیہ جلد ۱۳ شمارہ ۲، ۱ : ۱۳۴۸ فصلی (م ۱۹۳۰ء) ص ۶۳، سرخ سویرا ص ۸۹، ۹۰ : بساط رقص ص ۸۳، ۸۴، مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۱۷، ۱۱۸
آج کی رات نہ جا : (۱۹۵۶) رسالہ صبا، حیدر آباد دکن، نومبر دسمبر ۱۹۶۰ : بساط رقص : مخدوم، کلام مخدوم ص ۶۷، ۶۸
آری سہیلی : غیر مدون
آزادی وطن : رسالہ صبا، جولائی اگست ۱۹۶۳ء ص ۷۵ : سرخ سویرا ص ۸۹، ۹۰ : بساط رقص ص ۴۹ تا ۵۱ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۸۳، ۸۴
آسمانی لوریاں : سرخ سویرا ص ۲۱، ۲۲ : بساط رقص ص ۱۳، ۱۴ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۴۷، ۴۸
اپنا شہر : (۱۹۶۷) رسالہ صبا، اگست ۱۹۶۸ء ص ۶۰ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۶۵
احساس کی رات : رسالہ صبا، نومبر دسمبر ۱۹۶۰ ص ۶۰ : گل تر ص ۶۹، ۷۰ : بساط رقص ص ۱۹۶ تا ۱۹۸ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۲۶ تا ۲۲۸
استالین : سرخ سویرا ص ۱۱۰ تا ۱۱۸ : بساط رقص ص ۱۰۴ تا ۱۱۲ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۳۸ تا ۱۴۶
اقبال : سرخ سویرا ص ۶۲، ۶۳ : بساط رقص ص ۵۶، ۵۷ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۹۰، ۹۱

اقبال کی رحلت پر : سرخ سویرا ص ۶۸ : بساط رقص ص ۶۲ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۹۶

انتساب : رسالہ سب رس حیدر آباد دکن' اپریل ۱۹۴۲ء ص ۴۹ : سرخ سویرا ص ۴۴ : بساط رقص ص ۳۳ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۶۷

انتظار : سرخ سویرا ص ۳۶' ۳۷ : بساط رقص ص ۲۸' ۲۹ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۶۲' ۶۳

اندھیرا : سرخ سویرا ص ۱۰۱ تا ۱۰۳ : بساط رقص ص ۹۵ تا ۹۷ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۱۲۹ تا ۱۳۱ : رسالہ نقوش' لاہور عالمگیر امن نمبر ص ۴۳

انقلاب : سرخ سویرا ص ۹۸ تا ۱۰۰ : بساط رقص ص ۹۲ تا ۹۴ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۱۲۶ تا ۱۲۸

ایک چاندنی رات : غیر مدون

باغی : مجلہ عثمانیہ جلد ۱۴' شمارہ ۳' ۱۹۴۱ء ص ۹۲ : سرخ سویرا ص ۱۹' ۲۰ : بساط رقص ص ۱۱' ۱۲ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۴۵' ۴۶

برسات : سرخ سویرا ص ۳۹' ۴۰ : بساط رقص ص ۳۱' ۳۲ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۶۵' ۶۶

بلور : (۴ دسمبر ۱۹۶۱ء کو لکھی گئی) بساط رقص ص ۲۳۰' ۲۳۱ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۵۹' ۲۶۰

بنگال : سرخ سویرا ص ۱۲۱ تا ۱۲۴ : بساط رقص ص ۱۱۵ تا ۱۱۸ : مخدوم' کلام مخدوم ۱۴۹ تا ۱۵۲

بھاگ متی : گنبد محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی جلسہ منعقدہ ۱۱ جنوری ۱۹۵۸ء میں سنائی گئی۔ "نذر محمد قلی قطب شاہ" مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور' حیدر آباد دکن ۱۹۵۸ء ص ۷۶ : گل تر ص ۱۹' ۲۰ : بساط رقص ۱۳۹' ۱۴۰ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۱۶۹' ۱۷۰

پچھلے پہر کے چاند سے : سرخ سویرا ص ۳۸ : بساط رقص ص ۳۰ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۶۴

پرسہ : مجلہ عثمانیہ ۱۹۳۸ء ص ۲۳۰ : سرخ سویرا ص ۶۹، ۷۰ : بساط رقص ص ۶۳، ۶۴ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۹۷، ۹۸ (بنی کی قوت پر)

پشیمانی : مجلہ عثمانیہ جلد ۱۳ شمارہ ۳، ۱۹۳۱ء ص ۶۳ : رسالہ سب رس حیدر آباد دکن، جنوری ۱۹۴۱ء ص ۱۳۳ : سرخ سویرا ص ۹۲ : بساط رقص ص ۸۶ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۲۰

پاکستان ہمارا : اکتوبر ۱۹۴۶ میں حیدر آباد دکن میں منعقدہ کل ہند ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے موقع پر نشرگاہ حیدر آباد کے مشاعرہ میں سنائی گئی۔ کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔

پیار کی چاندنی : (۱۹۵۹) گل تر ص ۴۴، ۴۵ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۹۷، ۱۹۸

پیلا دوشالہ : جامعہ عثمانیہ کے طالب علمی کے دور کی نظم، کسی مجموعہ میں شامل نہیں۔ رسالہ، صبا حیدر آباد دکن، مخدوم نمبر ۱۹۶۹ء ص ۳۴۸

تلنگانہ : (۱۹۴۷ء میں لکھی گئی) گل تر ص ۸۳ تا ۸۵ : بساط رقص ص ۱۲۱

تلنگن : سرخ سویرا ص ۱۶ تا ۱۸ : بساط رقص ص ۵۸، ۵۹ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۴۷، ۱۴۸

تماشائی : گل تر ص ۸۶ تا ۸۸ : بساط رقص ص ۱۱۹، ۱۲۰ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۵۳، ۱۵۴

ٹوٹے ہوئے تارے : سرخ سویرا ص ۶۴، ۶۵ : بساط رقص ص ۸۵، ۵۹ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۵۳، ۱۵۴

جانبازان کیور : سرخ سویرا ص ۱۱۹، ۱۲۰ : بساط رقص، ص ۱۱۳، ۱۱۴ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۴۷، ۱۴۸

جان غزل : (۱۹۵۹ء میں لکھی گئی) گل تر ص ۴۲، ۴۳ : بساط رقص ص ۲۴۳، ۲۴۵ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۹۵، ۱۹۶

جز تیری آنکھوں کے (۱۰ دسمبر ۱۹۶۷) مخدوم کلام مخدوم ص ۲۶۷

جنگ : اخبار پیام، ۱۹۳۵ء صفحہ اول : سرخ سویرا ص ۴۲ تا ۴۴ : بساط رقص ص ۳۴ تا ۳۶ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۶۸ تا ۷۰

جنگ آزادی : سرخ سویرا ص ۱۰۴ تا ۱۰۶ : بساط رقص ص ۹۸، ۹۹ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۳۲ تا ۱۳۴

جوانی : سرخ سویرا ص ۲۷، ۲۸ : بساط رقص ص ۱۹، ۲۰ : مخدوم، کلام مخدوم ۵۳، ۵۴

جہان نو سرخ سویرا ص ۵۸ : بساط رقص ص ۵۲ : : مخدوم، کلام مخدوم ص ۸۶

چارہ گر : (۱۹۵۶ء میں لکھی گئی) گل تر ص ۱۴ تا ۱۶ : بساط رقص ص ۱۳۳ تا ۱۳۶ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۶۳ تا ۱۶۶

چاند تاروں کا بن : (۱۹۵۸ء میں لکھی گئی) گل تر ص ۲۱ تا ۲۳ : بساط رقص ص ۱۴۱ تا ۱۴۴ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۷۱ تا ۱۷۴

چپ نہ رہو : (۱۹۶۱ء میں لکھی گئی) گل تر ص ۷۱، ۷۲ : بساط رقص ص ۱۹۹، ۲۰۰ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۲۹، ۲۳۰ (لومبا کے قتل پر)

حویلی : سرخ سویرا ص ۷۵ تا ۷۸ : بساط رقص ص ۶۹ تا ۷۲ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۰۳ تا ۱۰۶

خواب بیداری : ہفت روزہ الاعظم ادبی نمبر ۱۹۳۵ء : رسالہ صبا، حیدرآباد دکن، مخدوم نمبر ۱۹۶۹ء ص ۳۴۸ (غیر مدون)

خواہشیں : یہ نظم رسالہ صبا مئی جون ۱۹۶۲ء میں صفحہ ۳۸ پر دھنک کے عنوان سے شائع ہوئی تھی : بساط رقص ص ۲۱۲، ۱۲۷ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۴۶، ۲۴۷

درہ موت : (ویت نام کے پس منظر میں) مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۷۱

دھواں : سرخ سویرا ص ۵۰ : بساط رقص ص ۴۲ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۷۶

رات کے بارہ بجے : (۱۹ مئی ۱۹۶۸ء کو لکھی گئی) مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۷۴ تا ۲۷۸

رت : (۱۹ مئی ۱۹۶۸ء کو لکھی گئی) مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۸۷، ۲۸۸

رقص : (۱۹۵۸ء میں لکھی گئی) رسالہ صبا مخدوم نمبر ۱۹۶۹ء ص ۳۳۹ : گل تر ص ۲۴، ۲۵ : بساط رقص ص ۱۳۵ تا ۱۳۷ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۷۵ تا ۱۷۸

روح فغفور : سرخ سویرا ص ۸۷، ۸۸ : بساط رقص ص ۸۱، ۸۲ : مخدوم، کلام

مخدوم ۱۱۵، ۱۱۶

زلف چلیپا : رسالہ سب رس حیدرآباد دکن اگست ۱۹۳۱ء ص ۷ : سرخ سویرا ص نمبر ۹۳ تا ۹۵ : بساط رقص ص ۸۷ تا ۸۹ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۳۱

ساگر کے کنارے : مجلہ عثمانیہ جلد ہشتم شمارہ ۳، ۴ : ۱۹۳۴ء ص ۲۳۲ : سرخ سویرا ص ۱۳ تا ۱۵ : بساط رقص ص ۵ تا ۷ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۹ تا ۳۱

سب کا خواب : بساط رقص ص ۲۲۳، ۲۲۴ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۵۲، ۲۵۳

سپاہی : سرخ سویرا ص ۹۶، ۹۷ : بساط رقص ص ۹۰، ۹۱ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۳۴ تا ۱۳۵

ستارے : سرخ سویرا ص ۱۰۷ تا ۱۰۹ : بساط رقص ص ۱۰۱ تا ۱۰۳ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۳۵ تا ۱۳۷

سجدہ : سرخ سویرا ص ۴۳، ۴۴ : بساط رقص ص ۱۵، ۱۶ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۴۹، ۵۰

سڑک : رسالہ صبا، اگست ۱۹۶۸ء ص ۷۰ : غیر مدون

سناٹا : (۱۹۶۱ میں لکھی گئی) گل تر ص ۷۹، ۸۰ : بساط رقص ص ۲۰۸، ۲۰۹ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۳۸، ۲۳۹

شاعر : سرخ سویرا ص ۳۴، ۳۵ : بساط رقص ص ۱۶، ۱۷ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۶۰، ۶۱

شام کا چہرہ ہے خون آلودہ : (یکم مئی ۱۹۶۸ء کو لکھی گئی) مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۶۹، ۲۷۰

طور : سرخ سویرا ص ۹ تا ۱۲ : بساط رقص ص ۱ تا ۴ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۳۵ تا ۳۸

غالب : (نظم ۲۴ فروری ۱۹۶۹ء کو رات میں لال قلعہ میں منعقدہ مشاعرے میں پڑھی گئی) مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۸۴

فاصلے : (۱۹۶۰ میں لکھی گئی۔ اس کا مرکزی خیال کماری اندرا دھن راج گیر کی انگریزی نظم Yearing سے ماخوذ ہے) رسالہ صبا، ستمبر اکتوبر ۱۹۶۰ ص ۲۹ : گل

تر ص ۶۳ تا ۶۸ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۱۹ تا ۲۲۵
فریاد : بساط رقص ص ۲۲۵ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۵۴
قلندر : (چغتائی کی بنائی ہوئی تصویر سے متاثر ہو کر) سرخ سویرا ص ۲۶' ۲۷ : بساط رقص ص ۶۰' ۶۱ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۹۴' ۹۵
قمر : سرخ سویرا ص ۸۴ تا ۸۶ : بساط رقص ص ۷۸ تا ۸۰ : مخدوم' کلام مخدوم ۱۱۲ تا ۱۱۴
قوالی : (۱۹۶۴ء میں لکھی گئی۔ کسی مجموعے میں شامل نہیں)
قید : (دوران اسیری چنچل گوڑہ سینٹرل جیل میں ۱۹۵۱ء لکھی گئی) گل تر ص ۹ تا ۱۱ : بساط رقص ص ۱۲۷ تا ۱۲۹ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۱۵۷ تا ۱۵۹
گگارن : (۱۹۶۱ء میں لکھی گئی) رسالہ صبا' اپریل ۱۹۶۱ء ص ۱۳ : گل تر ص ۷۴' ۷۵ : بساط رقص ص ۲۰۲' ۲۰۳ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۳۲' ۲۳۳
گھر : سرخ سویرا ص ۹۱ : بساط رقص ص ۸۵ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۱۱۹
گیت (۱) : (فلم "برسات" کے لئے لکھا گیا۔ کسی مجموعہ میں شامل نہیں)
گیت (۲) : (فلم "برسات" کے لئے لکھا گیا۔ کسی مجموعہ میں شامل نہیں)
لخت جگر : بساط رقص ص ۲۱۳ تا ۲۱۵ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۴۳ تا ۲۴۵
لمحہ رخصت : سرخ سویرا ص ۲۵' ۲۶ : بساط رقص ص ۱۷' ۱۸ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۵۱' ۵۲
مارٹن لوتھر کنگ : (مئی ۱۹۶۸ء میں لکھی گئی) مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۷۲' ۲۷۳
ماسکو : ماسکو کے ہوائی اڈے پر جہاز سے اترتے ہوئے کہی گئی' ۱۹۵۳) گل تر ص ۱۳ : بساط رقص ص ۱۳۱' ۱۳۲ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۱۶۱' ۱۶۲
محبت کی چھاؤں : سرخ سویرا ص ۵۱' ۵۲ : بساط رقص ص ۴۳' ۴۴ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۷۷' ۷۸
مسافر : سرخ سویرا ص ۷۹' ۸۰ : بساط رقص ص ۷۳' ۷۴ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۱۰۷' ۱۰۸
مستقبل : سرخ سویرا ص ۸۱ تا ۸۳ : بساط رقص ص ۷۵ تا ۷۷ : مخدوم' کلام

مخدوم ص ۱۰۹ تا ۱۱۱

مشرق : مجلّہ ملیسانئین، جنوری ۱۹۳۷ء ص ۷۷ : سرخ سویرا ص ۳۵، ۳۶ : بساط رقص ص ۳۷، ۳۸ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۷۱، ۷۲

معمہ : مجلّہ عثمانیہ ۱۹۳۵ء ص ۸۰ (کسی مجموعے میں شامل نہیں)

ملاقات : (۲۱ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لکھی گئی) مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۸۱

موت کا گیت : سرخ سویرا ص ۴۷ تا ۴۹ : بساط رقص ص ۳۹ تا ۴۱ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۷۳ تا ۷۵

مے : (غیر مطبوعہ)

میں : سرخ سویرا ص ۳۲، ۳۳ : بساط رقص ص ۲۴، ۲۵ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۵۸، ۵۹

نامہ حبیب : سرخ سویرا ص ۵۳، ۵۴ : بساط رقص ص ۴۵، ۴۶ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۷۹، ۸۰

نقاد : (غیر مطبوعہ)

نورس : سرخ سویرا ص ۷۳، ۷۴ : بساط رقص ص ۶۷، ۶۸ : مخدوم، کلام مخدوم ۱۰۱، ۱۰۲

نہرو : بساط رقص : ص ۲۲۲

نیا چمن : (۱۹۵۱ء میں لکھی گئی) گل تر ص ۱۲ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۶۰

نیا سال : بساط رقص ص ۲۲۹ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۵۸

نیند : (۱۹۳۸ء میں لکھی گئی، سرخ سویرا میں شامل ہونے سے رہ گئی) گل تر ص ۸۱، ۸۲

وادی فردا : بساط رقص ص ۲۱۰ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۲۰ تا ۲۲۲

واسوخت : (یکم مئی ۱۹۶۹ء میں لکھی گئی) مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۸۵، ۲۸۶

واک آؤٹ : (غیر مدوّن)

وصال : رسالہ صبا اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۲۷ : بساط رقص ص ۲۱۸ تا ۲۲۰ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۲۴۸ تا ۲۵۰

وقت بے درد مسیحا : بساط رقص ص ۲۲۶ تا ۲۲۸ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۵۵ تا ۲۵۸

ولی : رسالہ سب رس حیدرآباد دکن اگست ۱۹۴۲ء ص ۳۳ : سرخ سویرا ص ۵۹ تا ۶۱ : بساط رقص ص ۵۳ تا ۵۵ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۸۷ تا ۸۹

ہتی ہڑتال : (غیر مدون)

ہم دونوں : (۱۹۲۶ء کماری اندرا دھن راج گیر کی انگریزی نظم Both of Us سے مرکزی خیال ماخوذ) گل تر ص ۶۷ تا ۸۷ : بساط رقص ص ۲۰۴ تا ۲۰۷ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۳۴ تا ۲۳۷

یاد ہے : سرخ سویرا ص ۲۹ تا ۳۱ : بساط رقص ص ۲۱ تا ۲۳ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۵۵ تا ۵۷

۱) بلا عنوان نظم :

۲) نظم آزاد :

غزلیات

پھول کھلتے ہی رہے' کلیاں چٹکتی ہی رہیں
دل دھڑک جائے تو حاصل؟ آنکھ بھر آئے تو کیا

(بساط رقص ص ۱۸۸ : مخدوم کلام مخدوم ص ۲۱۸)

ایک تھا شخص زمانہ تھا کہ دیوانہ بنا
ایک افسانہ تھا' افسانے سے افسانہ بنا

(مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۶۳' ۲۶۴)

بڑھ گیا بادہ گلگوں کا مزہ آخر شب
اور بھی سرخ ہے رخسار حیا آخر شب

(۱۹۶۰ء میں کہی گئی : گل تر ص ۵۰' ۵۱ : بساط رقص ص ۱۷۲' ۱۷۳ : مخدوم' کلام مخدوم ص ۲۰۳' ۲۰۴)

سحر سے رات کی سرگوشیاں بہار کی بات

جہاں میں عام ہوئی چشم انتظار کی بات

(۱۹۵۹ء میں کہی گئی : گل تر ص ۳۶، ۳۷ : بساط رقص ص ۱۵۸، ۵۹
: مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۸۹، ۱۹۰)

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشم نم مسکراتی رہی رات بھر

ارمغان جشن سیمیں جامعہ عثمانیہ ۱۹۶۰ء ص ۲۶۱، گل تر ص ۵۹، ۶۰

وہی ہیں یادیں، وہی آہ صبح گاہ کا رنگ
نہ اب وہ پہلی سی باتیں نہ وہ نگاہ کا رنگ

(گل تر ص ۸۷ : بساط رقص ص)

اسی چمن میں چلیں، جشن یاد یار کریں
دلوں کو چاک، گریباں کو تار تار کریں

(۱۹۵۹ء میں کہی گئی : رسالہ صبا جون ۱۹۵۹ء ص ۲۵ : گل تر ص ۳۲،
۳۳ : بساط رقص ص ۱۵۴، ۱۵۵ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۸۵، ۱۸۶)

روشن ہے بزم شعلہ رخاں دیکھتے چلیں
اس میں وہ ایک نور جہاں دیکھتے چلیں

(۱۹۶۰ء میں کہی گئی : گل تر ص ۴۸، ۴۹ : بساط رقص ص ۱۷۰، ۱۷۱ : مخدوم،
کلام مخدوم ص ۲۰۱، ۲۰۲)

وہ جو چھپ جاتے تھے کعبوں میں صنم خانوں میں
ان کو لا لا کے بٹھایا گیا دیوانوں میں

(رسالہ صبا، اپریل ۱۹۶۰ء ص ۲۵ : گل تر ص ۵۲، ۵۳ : بساط رقص ص ۱۷۴،
۱۷۵ : مخدوم، کلام مخدوم ص ۱۸۷، ۱۸۸)

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، رنگ گل کا بیاں دوستو
گاہ گاتی ہوئی، گاہ ہنستی ہوئی، میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

(رسالہ صبا، جنوری ۱۹۶۲ء ص ۳۵ : بساط رقص ص ۱۸۵، ۱۸۶ : مخدوم، کلام
مخدوم ص ۲۱۵)

۳۷ : بساطِ رقص ص ۲۲۱ : مخدوم، کلامِ مخدوم ص ۲۵۱)

قطعات / رباعیات
(بغیر عنوان کے)

پہلا مصرع : اے حسن کے تاجدار آیا آیا

سرخ سویرا : ص ۱۵ مجلہ [illegible]، شمارہ ۳، ۱۹۴۱ء ص ۱۱۳

پہلا مصرع : تو نے کس دل کو دکھایا ہے تجھے کیا معلوم

سرخ سویرا : ص ۴۰ مجلّہ عثمانیہ جلد ۱۳، شمارہ ۳، ۱۹۴۱ء ص ۹۲

پہلا مصرع : گریباں چاک محفل سے نکل جاؤں تو کیا ہوگا

سرخ سویرا : ص ۴۴

پہلا مصرع : یہ رقص، رقصِ شرر ہی سہی، مگر اے دوست

گلِ تر : ص ۷۳

پہلا مصرع : اسی ادا سے اسی بانکپن کے ساتھ آؤ

گلِ تر : ص ۸۸

پانچ اشعار کا ایک بند

پہلا مصرع : فسوں کی رات میں اڑتے ہوئے سے افسانے

گلِ تر : ص ۸۸

فردیات (ردیف وار)

آتا مری دنیا کو خرابات بناتا
آنکھوں سے پلاتا کبھی ہونٹوں سے پلاتا

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا خیال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

بات کیا تھی ذکرِ کس کا تھا کہ ہنگامِ نشاط
مسکرانے والی آنکھیں ہچکیاں لینے لگیں

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو ساتھ زمانہ کو لے کے چلو
میری آنکھوں کی زباں اور میرے دل کی آواز
نہ سمجھنے کے لئے ہے نہ سنانے کے لئے
اب ایسی آندھیاں آنے کو ہی بدبخت عالم میں
قفس کا ذکر کیا' سارا چمن اڑ جانے کو ہے
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے چاندنی ہی چاندنی
جیسے وہ خود ساتھ ہیں ان کی جوانی ساتھ ہے

شفقت رضوی کی تحقیقی کاوشیں

☆--- اردو کے یوروپین شعراء' مطبوعہ ۱۹۸۱ء

ناشر : موڈرن پبلشرز' ایمپریس مارکیٹ' کراچی

☆--- سراج اورنگ آبادی' حیات اور فکر و فن' مطبوعہ ۱۹۸۴ء

ناشر : ادارہ تحقیق و تصنیف' علی گڑھ کالونی' کراچی

☆--- ہندے اور ان کی تاریخ' مطبوعہ ۱۹۸۶ء

ناشر : مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد

☆--- مولانا حسرت موہانی' مجاہد آزادی کامل' مطبوعہ ۱۹۸۷ء

ناشر : ادارہ تحقیقات افکار و تحریکات ملی' کراچی

☆--- دیوان مہ لقا بائی چندا مع مقدمہ' مطبوعہ ۱۹۹۰ء

مجلس ترقی ادب لاہور

☆--- ایک علمی خاندان (مولانا ابو الکلام آزاد' ان کے والد مولانا خیر الدین' بھائی غلام یسین آہ' بہنوں آرزو بیگم اور آبرو بیگم کے حالات زندگی اور علمی و ادبی خدمات)' مطبوعہ ۱۹۹۲ء

ناشر : ادارہ تحقیقات افکار و تحریکات ملی' کراچی

☆--- مکاتیب سر محمد اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی' مطبوعہ ۱۹۹۲ء

ناشر : ادارہ تحقیقات افکار و تحریکات ملی' کراچی

☆--- مولانا حسرت موہانی (کتابیات)' مطبوعہ ۱۹۹۳ء

مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد

☆--- مطالعہ حسرت موہانی' مطبوعہ ۱۹۹۴ء ۔

ناشر : گلرنگ پبلی کیشنز' کراچی

☆--- فیضان دکن (سلاطین آصفی کی علمی و ادبی سرپرستی کی روداد)' مطبوعہ ۱۹۹۴ء

ناشر : بہادر یار جنگ اکیڈمی' سراج الدولہ روڈ' کراچی

☆--- مخدوم محی الدین ۔ ایک تعارف' مطبوعہ ۱۹۹۴ء

ناشرین : ایوان اردو کراچی اور انجمن اردوئے معلی' کراچی